

(مشتاق احمد یوسفی)
(۱۹۲۳ء۔۲۰۱۸ء)

5 کافی

مصنف کا تعارف

مشتاق احمد یوسفی راجستھان کی ایک چھوٹی سی مسلم ریاست ''ٹونک'' کے ایک تعلیم یافتہ مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے نانا مسلم راٹھور تھے۔ان کے والد عبدالکریم خان یوسفی نے جے پور شہر میں کاروبار شروع کیا۔بعدازاں جے پور میونسپل کمیٹی کے چیئرمین اور ریاستی اسمبلی کی حزبِ مخالف کے راہ نما بھی رہے۔اسمبلی میں سقوطِ حیدرآباد کے بعد پاکستان کی حمایت میں تقریر کرنے پر ان کو ہجرت کر کے کراچی آنا پڑا۔

یوسفی صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور عربی، فارسی اور دینیات کے علوم پڑھے۔انٹرمیڈیٹ راجپوتانہ بورڈ سے درجہ اول میں پاس کیا۔بی۔اے آگرہ یونی ورسٹی سے اول درجہ میں پاس کیا اور 1945ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی سے ایم۔اے فلسفہ کی ڈگری بھی درجہ اول میں حاصل کی۔علی گڑھ کے تعلیمی اور تہذیبی اثرات کے زیرِ اثر ان کے جوہر کھلے۔1946ء میں راجپوتانہ سول سروس میں شامل ہوئے اور 1949ء تک وہیں رہے۔پاکستان آنے کے بعد بطور منیجر مسلم کمرشل بنک اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے پاکستان بینکنگ کونسل کے چیئرمین کے عہدے تک پہنچے۔

مشتاق احمد یوسفی ایک فطری مزاح نگار ہیں۔ان کی تحریروں میں اگرچہ سلیقہ مندی، رکھ رکھاؤ اور عبارت کی تزئین و آرائش کا خصوصی اہتمام ملتا ہے، اس کے باوجود ان کے جملے رواں، شگفتہ اور بے ساختہ ہوتے ہیں۔وہ بات سے بات نکالتے ہیں اور ایسے گہرے اور پوشیدہ معانی پیدا کرتے ہیں کہ وہ کسی مفکر کی بے ساختہ گفت گو کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ان کے موضوعات ہماری روزمرہ زندگی اور معمولات سے لیے گئے ہیں لیکن وہ ان میں بھی مزاح کے انوکھے اور چونکا دینے والے گوشے تلاش کر لیتے ہیں۔ان کے مزاح کی بنیاد ایک اعلیٰ تہذیبی شعور اور مذاقِ سلیم پر استوار ہوتی ہے۔

یوسفی صاحب کا قلم جس موضوع کو چھوتا ہے اس میں نئی روئیدگی اور بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ان کی کوئی ترکیب ایسی نہیں ہوتی جو قاری کو فکر و نظر کی نئی روشنی نہ دے جاتی ہو۔

مشہور مزاح نگار اور شاعر ابنِ انشا نے ان کے متعلق صحیح لکھا ہے کہ اگر مزاحیہ ادب کے موجودہ دور کو ہم کسی نام سے منسوب کر سکتے ہیں تو وہ یوسفی ہی کا نام ہے۔

یوسفی صاحب کے پانچ مجموعے شائع ہوئے: ''چراغ تلے''، ''خاکم بدہن''، ''زرگزشت''، ''آبِ گم'' اور ''شامِ شعرِ یاراں''۔

''خاکم بدہن'' پر انھیں ''آدم جی'' ادبی انعام سے بھی نوازا گیا۔

تدریسی مقاصد:

- ☆ مزاحیہ ادب کی خصوصیات اور اس کی اہمیت کو سمجھنا
- ☆ سبق ''کافی'' کے مرکزی خیال اور بنیادی نکات کو بیان کرنا
- ☆ مشتاق احمد یوسفی کے اسلوب نگارش (شوخیِ بیان، ظرافت، برجستگی) کی خصوصیات کی نشان دہی کرنا
- ☆ مزاحیہ تحریر کے ادبی حُسن اور زبان کی چاشنی کو محسوس کرنا

مشکل الفاظ کے معانی

سطر 29 **کافی:** (ایک گرم مشروب جو ایک پودے کی پھلیوں سے تیار کیا جاتا ہے، اس میں کیفین کی وافر مقدار موجود ہوتی ہے)، **سگار:** (تمباکو کے سوکھے پتوں کا بیلن نما بڑا اور موٹا سگریٹ جسے سلگا کر منھ سے پھونکا جاتا ہے)، **سوندھی سوندھی:** (دل کو خوش

کرنے والی مہک، بھینی بھینی خوش بو، خوش گوار بو، سوندھا پن)، قوتِ شامہ: (سونگھنے کی حس، ناک کی سونگھنے کی وہ قوت جس سے بُری بھلی بو کا فرق کیا جاتا ہے)، کوتاہی: (خامی، کمی، بے پروائی، نقص)، صریحاً: (واضح طور پر، کھلم کھلا، اعلانیہ، صاف صاف)، رفع شر: (برائی، اختلاف یا جھگڑا دور کرنے کا عمل، رفع فساد)، بھینی بھینی: (ہلکی ہلکی، مدھم مدھم، خوش گوار)، مہک: (بو، خوش بو، باس)، منطق: (معقول اور مؤثر گفت گو، دلیل، صحیح فکر سکھانے والا اُصول)، حلق: (منھ کے اندر کا حصہ جس سے غذا اور سانس لیتے ہیں، گلا)، انڈیلنا: (ڈالنا، گرانا، کسی سیال شے کو ایک برتن سے دوسرے برتن میں گرانا)، کشید کرنا: (نچوڑنا، عرق نکالنا، حاصل کرنا)، تڑپ کر بولے: (بے قرار ہو کر بولے، تلملا کر بولے)، ماکولات: (کھانے کے لائق چیزیں، ماکول کی جمع کھانے کی چیز)، معقولات: (اچھی باتیں، عقل اور منطق کی باتیں)، تاوقتیکہ: (اس وقت تک کہ، اس موقع تک کہ)، گھپلا: (گڑبڑ، دھاندلی، ہیر پھیر)، تلفظ: (لفظ کا منھ سے درست ادا ہونا، حروف یا الفاظ کا ادا کرنا)، لطف اندوز ہونا: (لذت حاصل کرنا، مزہ حاصل کرنا)، تربیت یافتہ: (اچھی تربیت پایا ہوا، شائستہ)، ذوق: (کسی چیز کی حقیقت سمجھنے کی صلاحیت، دل چسپی، شوق)، سوندھا پن: (مزہ، لذت، خوش بو)، لگی ہوئی کھیر: (دیگچی کے پیندے یا اطراف میں لگی ہوئی کھیر جو مزے اور ذائقے میں لطف دیتی ہے)، دھنگارے ہوئے: (بگھار لگایا ہوا، تڑکا لگایا ہوا)، رائتہ: (دہی میں رائی، زیرہ وغیرہ ڈال کر خوب پھینٹ کر بنایا گیا آمیزہ)، کھرچن: (وہ چیز جو دیگچی یا ہانڈی کے پیندے اور کناروں پر خشک ہو کر لگ جاتی ہے)، دُھنگار (بگھار یا تڑکے کا عمل، کھانے وغیرہ کو دھواں دینے کا عمل)، متلی: (قے، اُبکائی، جی متلانے کا عمل یا کیفیت)، تعجب: (حیرت، اچنبھا، انوکھا پن، حیرانی)، شرفا: (اچھے لوگ، شریف لوگ، معزز)، رغبت: (میلان، خواہش، شوق، دل چسپی)، چراندے ہو کر: (محاورہ: چڑ چڑا کر، خفا ہو کر، ناراض ہو کر، بدمزاجی سے)، قائل ہونا: (محاورہ: مان لینا، تسلیم کرنا، کسی کے فن، دلیل یا کمال کو تسلیم کر لینا)، کج بحثی: (نامعقول گفت گو، فضول بحث، بے ہودہ تکرار)، بحث: (مباحثہ، تکرار، لفظی سوال جواب)، دانستہ: (جان بوجھ کر، جانتے اور سمجھتے ہوئے، ارادہ کر کے)، دل آزاری: (دل دکھانے کا عمل، اذیت دینے کا عمل)، مشرب: (دین، مذہب، مسلک، اُصول، مزاج)

سبق 30 رائے: (تجویز، قائم شدہ خیال)، عالَم: (حالت، صورت، درجہ)، صورت: (حالت، چہرہ، شکل)، جھلا کر: (جھنجھلا کر، خفا ہو کر، تنگ آ کر)، معصوم: (بھولا بھالا، سیدھا سادہ، گناہوں سے پاک)، سچ مچ: (واقعی، دراصل، حقیقت میں، اصل میں)، مچلنا: (کسی چیز کے لیے ضد کرنا، اڑ جانا، ضد پر آنا)، تمیز: (اچھے برے کی پہچان، فرق، تہذیب)، پکّے گانے: (وہ گانے جن میں فنِ موسیقی کا کمال دکھایا جائے، پکے راگ)، لغو: (بے ہودہ، واہیات، بکواس، واہی تباہی)، ہرگز: (بالکل نہیں، قطعی نہیں، کبھی نہیں، کسی قیمت پر نہیں)، پکے راگ: (راگ یا راگنی کے مقررہ اُصول کے مطابق گائے جانے والے گانے، کلاسیکی موسیقی)، ایجاد: (اختراع، تخلیق، کسی نئی چیز کو وجود میں لانا)، ثقافتی مسائل: (ثقافت سے منسوب مسئلے، تہذیب و ثقافت سے متعلق مسئلے)، استصوابِ رائے عامہ: (اہم قومی یا سیاسی مسائل میں عوام سے براہِ راست رائے لینا)، انجام: (نتیجہ، اختتام، آخر، پورا ہونا، تکمیل)، شائقین: (آرزو مند، طلب گار، شائق کی جمع)، جرح: (اعتراض، سچائی معلوم کرنے کے لیے سوالات کا سلسلہ)، کلاسیکی موسیقی: (روایتی موسیقی جو راگ راگنیوں کے نظام کے تحت ہو)، استفسارِ رائے عامہ: (عام لوگوں کی/عوام کی کسی مسئلے پر رائے دریافت کرنا)، ناعاقبت اندیشی: (کم عقلی، کوتاہ بینی، بے وقوفی، نادانی)، بدمذاقی: (اچھے برے کی تمیز نہ کرنے کی حالت، بدذوقی، بے حسی)، دریافت کرنا: (کھوج لگانا، پوچھ گچھ کرنا، سوال کر کے معلوم کرنا)، بے زار: (ناخوش، خفا، اکتائے ہوئے ہونا)، قابلِ التفات: (دھیان دینے کے لائق، توجہ کے قابل)، جواز: (شرعی یا قانونی طور پر، قابلِ اجازت)، چشتی نہیں: (عادت نہیں جانا، لت نہ جانا)، احباب: (حبیب کی جمع، دوست، عزیز، پیارے)، چراغ پا ہونا: (بگڑ جانا، سخت ناراض ہونا، آگ بگولا ہونا)، ذاتیات: (شخصی یا نجی باتیں)، ضمن میں: (شامل، حق میں، بشمول، ذیل میں، بارے میں)، متضاد: (برعکس، الٹا، مخالف، ایک دوسرے کی ضد)، کرم فرما: (مہربان، عنایت کرنے والا، کنایۃً تشریف لانے والا)، پریشانی: (ناراضی، نفرت، خفگی، پریشانی)، محرومی: (مایوسی، بدنصیبی، ناکامی، بدبختی)، محمول کرنا: (قیاس کرنا، وابستہ کرنا، مشروط کرنا، منحصر کرنا)، کم بخت: (بدبخت، بدنصیب، کم نصیب)

سبق نمبر (31) حلفیہ عرض کرنا: (قسمیہ بیان کرنا، حلف اٹھا کر بیان کرنا)، تیزابیت: (تیزاب کی تاثیر، معدے میں اضافی تیزاب کی وجہ سے ہونے والی جلن)، جل اُٹھنا: (یکا یک جلنے لگنا، جلن ہونا، اچانک بھڑک اٹھنا، محاورۃً: تلملانا، ناراض ہونا، حسد کرنا)، تشخیص ناک نظروں سے: (پرکھنے کے انداز میں، مرض کی پہچان کرنے کے انداز میں)، گھورنا: (نظر جما کر دیکھنا، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا، غور سے دیکھنا)، حشر: (انجام، بُرا نتیجہ، درگت، ہنگامہ)، معتبر: (معزز، بلند مرتبہ، قابلِ اعتماد، قابلِ اعتبار)، تفکرات: (فکریں، تفکر کی جمع، اندیشے)، موقوف: (انحصار کیا گیا، ٹھہرایا گیا، منحصر)، خورونوش: (کھانا پینا، دانہ پانی، طعام)، خمیرۂ گاؤزبان: (چینی یا شکر میں قوام کی ہوئی گائے کی زبان سے مشابہ ایک بوٹی کی دوا)، راشن کارڈ: (غذا یا دیگر اشیا حاصل کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے جاری کردہ کارڈ، یہ کارڈ راشن بندی کے لیے جاری کیے جاتے ہیں)، شکر: (چینی، کھانڈ)، جوشاندہ: (جوش دی ہوئی نزلے کی دوا، کاڑھا، کڑوی کسیلی پینے کی چیز)، صنعت: (مصنوعات تیار کرنے کے کارخانے، انڈسٹری)، نفسِ امارہ: (شر کی جانب مائل کرنے والا قلب، گناہوں پر اکسانے والا نفس)، زہر مار کرنا: (زبردستی حلق سے اُتارنا، بلا رغبت کھانا، ناپسندیدہ چیز کھانے پر مجبور کرنا)، طبی ریسرچ: (بیماریوں سے متعلق کی جانے والی تحقیق، طبی تحقیق، بیماریوں کی وجوہات، نئے علاج اور ادویات دریافت کرنا)، اہلِ ذوق: (ادب کی سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ، کسی چیز یا بات کی حسن وخوبی کا ملکہ رکھنے والے لوگ)، مردم آزار: (لوگوں کو ستانے والا شخص، موذی، ظالم، اذیت پہنچانے والا)، دریافت کی: (تلاش اور تحقیق سے نئی چیز حاصل کرنا)، وثوق: (اعتماد، یقین)، یونان: (جنوب مشرقی یورپ کا علم وفن کا قدیم مرکز ملک، یونان میں بڑے بڑے حکیم اور فلاسفر گزرے ہیں)، چرائتہ: (مصفّی خون اور دافع بخار کی خاصیت رکھنے والا ایک پودا، پاکستان انڈیا یا بھوٹان، کشمیر اور فرانس میں پایا جاتا ہے)، یونانی طب: (یونانی طبیبوں کا رائج کردہ طریقۂ علاج جسے مسلمان طبیبوں نے بہت ترقی دی)، جُوِ اعظم: (لازمی حصہ، خاص طور پر ادویہ وغیرہ میں)، قیاس: (تخمینہ، اندازہ، خیال، گمان)، امر: (کام، فعل، عمل، معاملہ، بات)، تقویت: (تائید، مضبوطی، استحکام، طاقت)، قصبہ: (چھوٹا شہر، بڑا گاؤں)، کھپت: (مانگ، طلب، گنجائش)، عطائی: (غیر مستند ڈاکٹر یا طبیب)، شافی: (شفا دینے والا، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام، اصل میں ''اللہ شافی، اللہ کافی'' استعمال ہوا، یعنی اللہ تعالیٰ شفا دینے والا ہے)، مؤخرالذکر: (جس کا ذکر بعد میں کیا جائے، جس کا نام بعد میں لیا گیا ہو)، سفوف: (پسی ہوئی چیز، برادہ، طب میں پھکی وغیرہ کو کہتے ہیں، پاؤڈر)، نسخہ: (طبیب یا ڈاکٹر کا مجوزہ ادویہ وترکیب استعمال پر مشتمل ہدایت نامہ)، افراط: (فراوانی، بہتات، کثرت)، درآمد کرنا: (سامانِ تجارت، بیرونِ ملک سے کسی ملک کے اندر لانا)، معلوماتِ عامہ: (عام معلومات، عام باتوں کا علم، جنرل نالج)، نعمت: (خدا تعالیٰ کی عطا، مال، دولت، عطیہ)، براہِ راست: (بلا واسطہ، بغیر کسی ذریعے کے، سیدھا)، چشمِ تخیل: (سوچ اور دھیان کی رسائی، خیال میں لانا)، اربابِ ذوق: (قوتِ ذائقہ والے لوگ، حسن وخوبی سے آشنا لوگ)، عزیز: (محبوب، پیارا، دوست، ساتھی)، مشروبات: (مشروب کی جمع، پینے کے لائق چیزیں)، اعلیٰ کوالٹی: (دانش ور، دانا آدمی، عقل و دانش رکھنے والا)، دل کا کنول کھلنا: (محاورہ: خوش ہونا، شگفتہ دل ہونا)، رنگ دکھانا: (محارہ: لطف دکھانا، کیفیت دکھانا، اثر ظاہر کرنا)، چہکنا: (شادمان ہونا، خوش ہونا، طبیعت میں شوخی آنا، چہچہانا)، متفق: (اتفاق کیا ہوا، متحد، ایک ساتھ، ہم خیال، رضامند)، سیال: (بہنے والا مادہ، رواں رہنے والا، مائع چیز جیسے پانی تیل وغیرہ)، دعویٰ: (ادعا، حق، مطالبہ، یقین)

سبق نمبر (32) مفرح: (فرحت بخش، مسرت اور خوشی دینے والا)، نڈھال: (کمزور، ناتواں، بے حال، تھکا ماندہ)، بدمزاج: (اکھڑ، چڑچڑا، غصہ ور، بُرے مزاج کا)، ٹی پاٹ (TEA POT): (چائے دانی، چائے کی کیتلی، چائے کو دم لگانے والا برتن)، اشتیاق سے: (شوق سے)، شکردان: (چینی رکھنے کا برتن، شوگر پاٹ، چینی دان)، کیمیا گری: (سونا بنانے کا فن)، آنچ: (آگ، تاؤ، جوش، تپش)، کسر رہ جانا: (کمی رہ جانا، نقص باقی رہنا، کام کے مکمل ہونے میں تھوڑی سی کمی رہ جانا)، مشرقی افریقہ: (براعظم افریقا کا مشرقی خطہ جس میں کینیا، یوگنڈا اور تنزانیہ شامل ہیں)، دھوم تھی: (چرچا تھا، شہرت تھی)، پُرتکلف: (شان دار، اہتمام سے تیار کیا گیا، غیر معمولی)، خانساماں: (باورچی، کھانا پکانے والا)، حوصلہ افزائی: (ہمت افزائی، ہمت بڑھانا، شاباش دینا)،

ترکیب: (طریقہ، تدبیر، مختلف اجزا کو ملانے کا عمل)، حبشی: (حبشہ سے منسوب، سیاہ فام، ایتھوپیا کا باشندہ)، سہل: (باسہولت، سہولت سے، با آسانی)، گھولتا ہوا: (اُبلتا ہوا، نہایت گرم، جوش کھاتا ہوا)، موزے: (پاؤں پر پہننے کا ریشمی یا سوتی غلاف)، غضب ناک ہونا: (محاورہ: آپے سے باہر ہونا، بہت غصے میں ہونا، خفا ہونا، غصے سے بھر جانا)، سہم گیا: (ڈر گیا، خوف زدہ ہو گیا)، تندی: (شدت، تیزی، زور)، تلخی: (ناگواری، بدمزگی، کڑواہٹ، کڑواپن)، عادی: (کسی چیز کی مستقل عادت رکھنے والا، خوگر)، کڑوی: (تلخ، بدمزہ، ناگوار، کسیلی)، کڑواہٹ: (تلخی، کڑواپن، بدمزگی، کسیلا پن)، آمیزش: (ملاوٹ، میل میلاپ، اختلاط، خلط ملط)، قوام: (خمیر، شیرہ، چاشنی، چینی یا گڑ کا گاڑھا شیرہ)، تاب نہیں لاسکتی: (برداشت نہیں کرسکتی)، اصرار: (ضد، کسی فعل یا قول پر اڑے رہنا، تاکید کرنا، بار بار کہنے کا عمل)، عداوت: (دشمنی، بغض، کینہ، عناد)، تکلف: (ظاہرداری، بناوٹ)، محمول: (گمان کیا گیا، قیاس کیا گیا)

صفحہ نمبر 33 تلخی کام و دہن: (کھانے پینے میں کڑواہٹ کا لطف لینا، کڑوا کسیلا کھانا پینا)، گوارا: (لذیذ، مرغوب، طبیعت کو پسند ہونا)، حامی: (حمایت کرنے والا، حمایتی)، گرہستی: (خانہ داری، گھر داری، گھر کے کام کاج)، موازنہ: (مقابلا کرنا، اندازہ کرنا، جانچنا)، ذہن نشین کرنا: (یاد کرنا، اچھی طرح ذہن میں بٹھانا)، خدانخواستہ: (خدا نہ کرے، اللہ نہ کرے، دعائیہ کلمہ، کسی تکلیف دہ امر کے موقع پر نیک خواہش کا اظہار)، شبہ: (شک، گمان، وہم)، راقم السطور: (تحریر لکھنے والا اپنی ذات کے لیے استعمال کرتا ہے)، غلط فہمی: (نادانی، ناسمجھی، شک)، ازالہ: (زائل کرنے کا عمل، دور کرنا، مٹانا)، ازبس ضروری: (بے حد ضروری ہونا، بہت زیادہ لازمی ہونا)، پھونک پھونک کر: (نہایت احتیاط سے کوئی کام کرنا)، پشیمان: (شرمندہ، نادم)، ارمان: (آرزو، خواہش، تمنا، محرومی وغیرہ پر افسوس، تاسف)

توضیحات

1۔ **پکا گانا:** پکا گانا سے مراد ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی وہ صنف ہے جو قواعد و ضوابط کی پابند، تکنیکی طور پر مشکل، اور پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس میں سُر (نوٹ)، تال (ردھم)، اور راگ (میلوڈی کا فریم ورک) کی پختگی اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خیال اور دھرو پد اس کی بنیادی شکلیں ہیں۔ پکا گانا وہ موسیقی ہے جسے سیکھنے کے لیے طویل تربیت اور ریاضت درکار ہوتی ہے اور یہ موسیقی کے اصولوں کی مکمل پابندی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے برعکس، کچا گانا وہ ہلکی پھلکی یا لوک موسیقی ہے جو کم تکنیکی ہوتی ہے۔

2۔ **کلاسیکی موسیقی:** کلاسیکی موسیقی سے مراد وہ موسیقی ہے جو رسمی، روایتی، اور اصولوں کی پابند ہوتی ہے، جسے سیکھنے کے لیے طویل اور سخت تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں تکنیکی گہرائی، پیچیدہ کمپوزیشن، اور رسمی ڈھانچا ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں کلاسیکی موسیقی کی دو بڑی شاخیں ہیں: مغربی کلاسیکی موسیقی اور جنوبی ایشیائی کلاسیکی (ہندوستانی/ کارناٹک) موسیقی۔ یہ موسیقی نہ صرف تفریح کے لیے بلکہ روحانی اظہار اور ثقافتی ورثے کے طور پر بھی دیکھی جاتی ہے۔

3۔ **السر (Ulcer):** السر ایک طبی حالت ہے جس میں جسم کے کسی حصے کی جھلی (Membrane) میں زخم یا کٹاؤ آجاتا ہے۔ عام طور پر یہ اصطلاح پیٹ کا السر یا آنتوں کا السر کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ زخم عام طور پر بیکٹیریا (H.pylori) یا پیٹ میں تیزاب کی زیادتی کی وجہ سے بنتے ہیں۔ السر کی علامات میں پیٹ میں شدید درد، جلن، اور متلی ہونا شامل ہیں۔ علاج کے لیے عموماً تیزاب کو کم کرنے والی ادویات اور طرزِ زندگی میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔

4۔ **یونانی طب:** یونانی طب ایک قدیم اور روایتی نظامِ علاج ہے جو یونان سے شروع ہوا اور عرب اور جنوبی ایشیا میں پروان چڑھا۔ اس کا بنیادی مقصد صحت کو برقرار رکھنا اور بیماریوں کا علاج قدرتی طریقوں (جیسے جڑی بوٹیاں، مناسب غذا،

اور طرزِ زندگی میں تبدیلی) سے کرنا ہے۔ یہ طب مریض کے مزاج کو سمجھ کر علاج پر زور دیتی ہے اور اسے آج بھی برصغیر میں طبِ یونانی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

5۔ خمیرۂ گاؤزبان: خمیرہ گاؤزبان یونانی طب میں استعمال ہونے والی ایک مشہور روایتی دوا ہے۔ یہ جڑی بوٹیوں پر مبنی ایک معجون ہے جسے خاص طور پر گاؤزبان نامی پودے کے پتوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ دوا عام طور پر دل کو مضبوط کرنے، ذہنی دباؤ کو کم کرنے، یادداشت بہتر بنانے اور دماغی اعصاب کو سکون دینے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اس کا استعمال نزلہ، زکام، اور کھانسی کے علاج میں بھی کیا جاتا ہے، اور اسے اس کی خوش ذائقہ اور قوت بخش خصوصیات کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔

6۔ جوشاندہ: جوشاندہ بھی یونانی طب کی ایک مشہور دوا ہے جو بنیادی طور پر جڑی بوٹیوں کو پانی میں ابال کر تیار کی جاتی ہے۔ ''جوشاندہ'' کا مطلب ہی ''ابال کر تیار کی گئی چیز'' ہے۔ یہ عام طور پر گلے کی خرابی، کھانسی، نزلہ، اور زکام جیسی سانس کی بیماریوں کے علاج کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس میں مختلف قدرتی اجزا (جیسے ملٹھی، السی، اور بنفشہ) شامل ہوتے ہیں۔ یہ ایک آسان، موثر، اور گھریلو علاج کے طور پر بہت مقبول دوا ہے اور اسے گرم گرم پیا جاتا ہے۔

7۔ بقراط: بقراط یونان کا ایک عظیم اور مشہور طبیب تھا جسے آج بھی ''بابائے طب'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے طب کو جادو، توہم پرستی، اور مذہبی عقائد سے الگ کیا اور اسے سائنسی مشاہدات اور عقلی بنیادوں پر استوار کیا۔ یونانی طب کے بہت سے اصول بقراط کے فلسفے پر مبنی ہیں۔ ان کا سب سے مشہور اصول ''بقراطی حلف'' ہے، جو آج بھی دنیا بھر میں طبی اخلاقیات کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، جس میں مریض کی رازداری اور دیکھ بھال پر زور دیا جاتا ہے۔

8۔ کافی ہاؤس (Coffee House): کافی ہاؤس ایک ایسی سماجی اور ثقافتی جگہ ہے جہاں لوگ کافی یا دیگر مشروبات سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ گفت گو، مطالعہ یا سماجی میل جول کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ تاریخی طور پر، کافی ہاؤس یورپ میں 17ویں اور 18ویں صدی میں فکری، ادبی اور سیاسی تبادلۂ خیال کے مراکز بن گئے تھے۔ برصغیر میں بھی یہ نوجوانوں، ادیبوں، اور اساتذہ کے لیے بحث و مباحثہ، ادبی تنقید، اور تخلیقی خیالات کے لیے اہم سماجی مرکز رہے ہیں۔ یہ جمہوری سوچ اور فکری آزادی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

سبق کا خلاصہ

میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ کافی کیوں پیتے ہیں؟ انھوں نے فوراً الٹا سوال کر دیا کہ آپ کیوں نہیں پیتے؟ میں نے کہا کہ مجھے کافی میں سگار جیسی بو آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تمھاری قوتِ شامہ کی کمزوری ہے، کیوں کہ کافی کی خوش بو سوندھی اور بھینی ہوتی ہے۔ ان کا اشارہ صریحاً میری ناک کی طرف تھا، مگر میں نے رفعِ شر کے لیے کہا کہ مان لیتا ہوں کہ کافی میں واقعی بھینی بھینی خوش بو ہے، لیکن یہ کہاں کی منطق ہے کہ جو چیز ناک کو بھلی لگے، اسے حلق میں انڈیلا جائے۔ اگر ایسا ہے تو کافی کا عطر کشید کر لینا چاہیے تاکہ لوگ ادبی محفلوں میں لگا لیا کریں۔ وہ تڑپ کر بولے کہ میں کھانے پینے کی چیزوں میں عقل کی بحث جائز نہیں سمجھتا۔ کافی کی خوش بو سے لطف اندوز ہونے کے لیے ذوق کی تربیت درکار ہے۔ یہی سوندھا پن لگی ہوئی کھیر اور دھنگارے ہوئے رائتے میں ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے ان دونوں سے متلی ہوتی ہے۔ وہ حیران ہوئے کہ یو۔پی میں تو یہ چیزیں شوق سے کھائی جاتی ہیں۔ میں نے کہا کہ اسی بنا پر میں نے ہندوستان چھوڑا۔

وہ کہنے لگے کہ آپ قائل ہو کر بھی بحث کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہمارے ملک میں بحث قائل ہونے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے کیوں کہ دانستہ دل آزاری ہمارے مشرب میں گناہ ہے، اس لیے ہم اپنی اصل رائے صرف نشے یا غصے میں ظاہر کرتے ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ اگر کافی واقعی خوش ذائقہ ہے تو کسی بچے کو پلا کر دیکھ لیجیے۔ وہ بولے کہ آپ بحث میں معصوم بچوں کو کیوں گھسیٹتے ہیں؟ میں نے کہا کہ آپ ہمیشہ بچوں سے پہلے لفظ ''معصوم'' کیوں لگاتے ہیں؟ کیا کچھ بچے گناہگار بھی ہوتے ہیں؟

خیر، اگر آپ کو بچوں پر اعتراض ہے تو بلی کو لیجیے۔ میں نے کہا کہ بلی اس لیے بہتر مثال ہے کہ بچے اور بلیاں پینے کی چیزوں میں بھلے برے کی بہتر پہچان رکھتے ہیں۔ وہ بولے کہ کل کو آپ کہیں گے کہ چوں کہ بلیاں پکے راگ نہیں سمجھ سکتیں، اس لیے وہ بھی لغو ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں، پکے راگ تو انھیں کی ایجاد ہیں، آپ نے کبھی بچوں کا رونا اور بلیوں کا لڑنا نہیں سنا۔ وہ بولے کہ بہر حال ثقافتی فیصلے بچوں اور بلیوں پر نہیں چھوڑے جا سکتے۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ کافی کے بارے میں رائے لینا ناممکن ہے۔ لوگ جواب دینے کے بجائے الٹا جرح شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے نتیجہ نکالا کہ کافی یا کلاسیکی موسیقی پر رائے لینا بڑی ناعاقبت اندیشی ہے، جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر پوچھنا۔ ایک شخص ملا جو واقعی کافی سے بے زار تھا، مگر وہ کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔ ایک اور صاحب نے کہا کہ کافی عادت کی بات ہے، ''چھٹتی نہیں منہ سے یہ کافی لگی ہوئی۔'' کچھ لوگ تو اس سوال سے ناراض ہو کر ذاتی حملے شروع کر دیتے ہیں۔ ایک نے کہا کہ تم نے شاید کبھی پی ہی نہیں، میں نے کہا کہ بیسیوں گیلن پینے کے بعد ہی یہ سوال کیا ہے۔ ایک اور صاحب نے مجھ سے معدے کے زخموں کے بارے میں پوچھا اور بڑی تشویش ناک نظروں سے دیکھا۔

میں نے سوچا کہ قدرت نے کوئی چیز بے کار نہیں بنائی۔ اگر غور کیا جائے تو ہر بری چیز میں بھی کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے۔ مثلاً: حقہ پینے سے تفکرات دور رہتے ہیں، مرچیں کھانے سے کھانوں کا اصل ذائقہ دب جاتا ہے، خمیرہ گاؤزبان سے شکر حاصل ہوتی ہے، شلجم اس لیے کھاتے ہیں کہ ان میں وٹامن ہوتا ہے۔ مگر جدید تحقیق کہتی ہے کہ کافی میں سوائے کافی کے کچھ نہیں ہوتا۔ شاید یہی بات اہلِ ذوق کو پسند ہے۔

یہ معلوم نہیں کہ کافی کب اور کس نے ایجاد کی، مگر یقین ہے کہ یونانیوں کو اس کا علم نہیں تھا، ورنہ وہ اسے طب کا حصہ بنا لیتے۔ اب ہمارے ملک میں عطائی ''اللہ شافی، اللہ کافی'' کہہ کر اپنے نسخوں میں کافی کا سفوف لکھنے لگے ہیں۔ سنا ہے کہ چائے کے باغات خوب صورت ہوتے ہیں، اس لیے قیاس ہے کہ کافی بھی زمین ہی سے اگتی ہوگی، کیوں کہ یہ ان چیزوں میں سے نہیں جو آسمان سے نازل ہوں۔ مگر میری عقل یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ کافی باغوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر کسی ملک میں ایسا ہے تو وہاں کے جنگلوں میں جانے کیا اگتا ہوگا۔ کچھ لوگ کافی کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی، اور مجھے اپنا ملک اس لیے عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

میں مشروبات کا ماہر نہیں ہوں، اس لیے مشروب کے اچھے یا برے ہونے کا اندازہ اس کے اثرات سے لگاتا ہوں۔ کافی ہاؤس کی فضا عجیب ہوتی ہے، ہر طرف شور و غل اور ذہنی کہرا چھایا رہتا ہے۔ لوگ کافی پیتے پیتے فلسفے جھاڑتے ہیں اور غروبِ آفتاب سے رات گئے تک بحث کرتے ہیں۔ پھر روٹھ کر اٹھتے ہیں مگر کچھ دیر بعد پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ کافی سے دل کا کنول کھل جاتا ہے، آدمی چہکنے لگتا ہے۔ میں نے کہا ٹھیک کہا، کیوں کہ کوئی معقول آدمی یہ پی کر خاموش نہیں رہ سکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ کافی سے دماغ روشن ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ بتانے لگے کہ ایک دن دفتر سے تھکے ہارے آئے تو بیوی نے کافی لا کر دی۔ میں نے پوچھا پھر کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ میں نے دودھ دان سے کریم نکالی، شکر دان سے شکر نکالی۔ مجھے غصہ آیا مگر کافی کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ عمدہ کافی بنانا بھی ایک فن ہے، جیسے کیمیا گری۔ ہر گھر اور کافی ہاؤس کا الگ نسخہ ہوتا ہے۔ ایک انگریز افسر کے حبشی خانساماں نے بتایا کہ وہ کافی آقا کے موزے میں چھانتا ہے، مگر صاف موزے میں نہیں۔

میں کافی کی تلخی سے نہیں گھبراتا کیوں کہ کڑوی دواؤں کا عادی ہوں۔ مگر مٹھاس اور تلخی کی آمیزش برداشت نہیں کر سکتا۔ جب میزبان پوچھتا ہے ایک چمچہ یا دو تو میں کہتا ہوں کہ میرے لیے شکر دان میں کافی کے دو چمچے ڈال دیجیے۔ کھانے پینے میں، میں ذائقے کا فیصلہ زبان پر چھوڑ دیتا ہوں، عقل پر نہیں۔ پہلا گھونٹ ہی فیصلہ کن ہوتا ہے۔

مشرقی اور مغربی مشروبات کا موازنہ کرتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ ہمارے مشرقی مشروبات جیسے ستو، فالودہ اور یخنی میں کھانے اور پینے دونوں کی خصوصیات ہیں۔ یہ نہ صرف غذائیت بلکہ ذائقہ بھی رکھتے ہیں۔ اب ان کا استعمال کم ہو گیا ہے۔ آخر میں میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے کافی سے بیزاری چائے کی محبت میں نہیں، حقیقت یہ ہے کہ کافی کا جلا چائے بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔

مرکزی خیال

انسان اکثر اپنے ذوق، عادات اور پسند کو عقل و منطق سے بالاتر سمجھ کر اس پر فخر کرتا ہے، حالاں کہ اکثر اوقات یہ محض اندھی تقلید، فیشن یا دکھاوے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس سے انسان کی طبیعت کی تضاد پسندی اور خود فریبی واضح ہوتی ہے۔ سبق میں مزاحیہ انداز میں بتایا گیا ہے کہ لوگ کافی جیسی عام چیز کو بھی عقل سے نہیں، بلکہ رواج، عادت یا مغربی اثر کے تحت پسند کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں لوگ بحث برائے بحث کے عادی ہیں اور اپنی پسند کو دلیل سے زیادہ جذبات کے ذریعے منوانا چاہتے ہیں۔ یہ سبق انسان کی غیر منطقی عادتوں اور سماجی دکھاوے پر طنز ہے۔

اہم عبارات کی تشریح

نوٹ: (جو طلبہ ہر عبارت کا الگ الگ سیاق و سباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس سبق کی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل درج ذیل اجمالی سیاق و سباق لکھ سکتے ہیں۔)

اجمالی سیاق و سباق

مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے ذائقے اور اس کے بارے میں ''اعلیٰ ذوق'' کے دعووں سے انھیں شدید کوفت ہے۔ ان کے مطابق کافی کے بارے میں کسی سے رائے پوچھنا عاقبت نا اندیشی ہے، کیوں کہ شائقین دلیل دینے کی بجائے الٹا جرح پر اتر آتے ہیں۔ مصنف کافی کو ایک ناگوار اور کڑوا مشروب سمجھتے ہیں اور اس کی تیاری کے غیر صفائی والے طریقوں پر طنز کرتے ہیں۔ وہ کافی پینے والوں کو طنزیہ طور پر جنتی قرار دیتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک دنیا میں یہ عذاب جھیل لینے کے بعد ان پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ مصنف یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ ان کی کافی سے بے زاری کا مطلب چائے کی طرف داری ہرگز نہیں ہے۔

عبارت نمبر 1

میں نے سوال کیا ''آپ کافی کیوں پیتے ہیں؟''

انھوں نے جواب دیا: ''آپ کیوں نہیں پیتے؟''

''مجھے اس میں سگار کی سی بو آتی ہے۔''

''اگر آپ کا اشارہ اس کی سوندھی سوندھی خوش بو کی طرف ہے تو یہ آپ کی قوّتِ شامہ کی کوتاہی ہے۔''

گو کہ ان کا اشارہ صریحاً میری ناک کی طرف تھا۔ تاہم رفعِ شر کی خاطر، میں نے کہا: ''تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتا ہوں کہ کافی میں سے واقعی بھینی بھینی مہک آتی ہے مگر یہ کہاں کی منطق ہے کہ جو چیز ناک کو پسند ہو وہ حلق میں انڈیل لی جائے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کافی کا عطر کیوں نہ کشید کیا جائے تاکہ ادبی محفلوں میں ایک دوسرے کے لگایا کریں۔''

تڑپ کر بولے: ''صاحب! میں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا، تاوقتیکہ اس گھپلے کی اصل وجہ تلفظ کی مجبوری نہ ہو۔ کافی کی مہک سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت ہے۔ یہی سوندھا پن لگی ہوئی کھیر اور دُھنگارے رائتے میں ہوتا ہے۔ میں نے معذرت کی: ''کھرچن اور دُھنگار دونوں سے مجھے متلی ہوتی ہے۔''

حوالۂ متن

سبق کا عنوان:	کافی
مصنف کا نام:	مشتاق احمد یوسفی
ماخذ:	چراغ تلے
صنف:	انشائیہ/مزاحیہ مضمون

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سبق کی پہلی عبارت ہے، اس لیے اس کا سیاق نہیں ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے ذائقے اور اس کے بارے میں ''اعلیٰ ذوق'' کے دعووں سے انھیں شدید کوفت ہے۔ ان کے مطابق کافی کے بارے میں کسی سے رائے پوچھنا عاقبت نااندیشی ہے، کیوں کہ شائقین دلیل دینے کی بجائے الٹا جرح پر اتر آتے ہیں۔ مصنف کافی کو ایک ناگوار اور کڑوا مشروب سمجھتے ہیں اور اس کی تیاری کے غیر صفائی والے طریقوں پر طنز کرتے ہیں۔ وہ کافی پینے والوں کو طنزیہ طور پر جنتی قرار دیتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک دنیا میں یہ عذاب جھیل لینے کے بعد ان پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ مصنف یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ ان کی کافی سے بے زاری کا مطلب چائے کی طرف داری ہرگز نہیں ہے۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی، ذہانت اور نفاست ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کی تحریر میں مزاح کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے جملے نہایت پختہ، شوخ اور تہہ دار ہوتے ہیں جو قاری کو مسکرانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ شاملِ نصاب سبق ''کافی'' میں بھی زبان کی صفائی، محاورات کا برمحل استعمال اور اندازِ بیان کی شائستگی نمایاں ہے۔ یہ مضمون مزاح اور فکری لطافت کی عمدہ مثال ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف دو اشخاص کے درمیان ہونے والی ایک نہایت دل چسپ، شگفتہ اور فکری گفت گو کے بارے میں بتاتا ہے۔ بظاہر یہ گفت گو کافی پینے یا نہ پینے کے بارے میں ہے، لیکن حقیقت میں یہ انسانی ذوق، منطق، احساس، فہم، ضد اور مزاح کے امتزاج کو ظاہر کرتی ہے۔ مصنف نے عام زندگی کے ایک چھوٹے سے موضوع کو نہایت ذہانت اور لطیف مزاح کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری ایک طرف مسکراتا ہے اور دوسری طرف سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ انسان کس طرح اپنی پسند اور رائے کو برتر سمجھتا ہے۔ مصنف اپنے دوست سے پوچھتا ہے کہ: ''آپ کافی کیوں پیتے ہیں؟'' یہ سوال بظاہر سیدھا اور سادہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں ایک طنزیہ پہلو چھپا ہوا ہے۔ دراصل مصنف کافی پینے کو ایک غیر ضروری یا غیر معقول بات سمجھتا ہے اور اسی حیرانی کے انداز میں سوال کرتا ہے کہ آخر لوگ اس تلخ مشروب کو اتنے شوق سے کیوں پیتے ہیں۔ وہ خود کافی کو پسند نہیں کرتا اور اس کی بو یا ذائقہ اسے ناگوار لگتا ہے، اس لیے اس کے سوال میں تعجب، بے زاری اور ہلکی سی چبھن موجود ہے۔ مصنف کا دوست فوراً پلٹ کر کہتا ہے: ''آپ کیوں نہیں پیتے؟'' یہ الٹا سوال دراصل دفاعی انداز میں دیا گیا جواب ہے۔ وہ اپنی عادت یا پسند کا دفاع کر رہا ہے۔ جیسے اکثر لوگ اپنی پسندیدہ چیز کے بارے میں تنقید سن کر ناراض یا پرجوش ہو جاتے ہیں، ویسے ہی یہ شخص بھی اپنی پسند کا جواز پیش کرنے کے لیے فوراً جواب میں سوال کرتا ہے۔ سوال کا جواب، سوال کی صورت میں دینا بھی ذہانت کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک عربی مقولہ ہے:

اَلْجَوَابُ بِمِثْلِ السُّؤَالِ حِكْمَة

ترجمہ: سوال جیسے انداز میں ہی جواب دینا بھی حکمت ہے۔

مصنف جواب دیتا ہے کہ مجھے اس میں سگار کی سی بو آتی ہے۔ یہاں وہ کھل کر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرتا ہے۔ سگار تمباکو کا پتہ لپیٹ کر بنایا جاتا ہے جس کی بو تیز، کڑوی اور دھوئیں دار ہوتی ہے۔ کافی کی خوش بو بھی بھنی ہوئی چیزوں جیسی ہوتی ہے، جو ہر کسی کو پسند نہیں آتی۔ اس لیے مصنف کو یہ مہک تمباکو یا سگار جیسی لگتی ہے، یعنی اسے یہ خوش بو بُری معلوم ہوتی ہے۔ مصنف کا دوست تھوڑا سا برا مان کر کہتا ہے کہ اگر آپ کا اشارہ اس کی سوندھی سوندھی خوش بو کی طرف ہے تو یہ آپ کی قوتِ شامہ کی کوتاہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم کافی کی خوش بو کو ناگوار سمجھتے ہو تو یہ کافی کا نہیں بلکہ تمھاری ناک کا قصور ہے۔ تمھیں اصل خوش بو محسوس ہی نہیں ہو رہی۔ وہ کافی کی خوش بو کو ''سوندھی سوندھی'' کہتا ہے۔ گویا اس کے نزدیک کافی کی خوش بو نفاست اور ذوق کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف طبیعتوں اور مزاجوں پر پیدا کیا ہے اسی لیے ان کے احساسات اور ذوق میں تنوع ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ
وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ (سورۃ الروم:22)

ترجمہ: ''اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمھاری زبانوں اور تمھارے رنگوں کا اختلاف ہے، بے شک اس میں علم والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

مصنف کہتا ہے کہ گو کہ ان کا اشارہ واضح طور پر میری ناک کی طرف تھا یعنی وہ براہِ راست مجھ پر طنز کر رہے تھے۔ لیکن چوں کہ وہ ایک باوقار اور شائستہ مزاج انسان ہے اس لیے اس نے لڑائی جھگڑے کی بجائے نرمی اختیار کی۔ وہ کہتا ہے: ''رفعِ شر کی خاطر، میں نے کہا: تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتا ہوں کہ کافی میں سے واقعی بھینی بھینی مہک آتی ہے۔ یعنی میں وقتی طور پر تمھاری بات مان لیتا ہوں تا کہ بحث ختم ہو جائے۔ لیکن اگلے ہی لمحے مصنف ایک نہایت منطقی بات کہہ کر بحث کو نیا رخ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کسی چیز کی خوش بو اچھی لگتی ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے پیا بھی جائے؟ مثال کے طور پر پھولوں کی خوش بو دل کو بھاتی ہے مگر ہم انھیں کھاتے نہیں۔ عطر کی مہک خوش گوار ہوتی ہے مگر کوئی اسے حلق میں نہیں اتارتا۔ تو پھر کافی کی خوش بو اگر اچھی لگتی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اسے پیا بھی جائے۔

اگر کافی کی خوش بو اتنی ہی دل کش ہے تو اسے پینے کی بجائے عطر کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس طرح لوگ محفلوں میں کافی کی خوش بو لگا کر بیٹھیں اور خوش بو سے لطف اٹھائیں، پینے کی زحمت نہ کریں۔ یہ بات کافی پینے والے دوست کو ناگوار گزرتی ہے۔ وہ فوراً کہتا ہے کہ صاحب! میں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا۔ یعنی کھانے پینے کی چیزوں میں عقل و منطق کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ کھانے پینے کا تعلق احساس اور ذوق سے ہے، نہ کہ منطق سے۔ اس کے نزدیک جو چیز مزے کی ہو، اسے صرف محسوس کرنا چاہیے، اس کے پیچھے فلسفہ نہیں بگھارنا چاہیے۔

وہ مزید کہتا ہے: ''تاوقت یہ کہ اس گھپلے کی اصل وجہ تلفظ کی مجبوری نہ ہو۔'' یہ فقرہ ہلکے طنز کے ساتھ کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ شاید تمھیں کافی اس لیے بری لگتی ہے کہ تم خود اس کے ذائقے، نام یا تلفظ سے مانوس نہیں ہو۔ گویا وہ مصنف پر چوٹ کرتا ہے کہ تمھارا ذوق ناقص ہے، تم نے کافی کا صحیح ذائقہ چکھا ہی نہیں۔ وہ کافی کی تعریف میں کہتا ہے کہ کافی کی مہک سے لطف اندوز ہونے کے لیے تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت ہے۔ یعنی کافی کا ذائقہ اور خوش بو عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے نفیس ذوق چاہیے جو ہر کسی میں نہیں ہوتا۔ یہاں وہ کافی کے شوق کو ایک آرٹ یا مہارت کے درجے پر لے جاتا ہے، جیسے مصوری یا موسیقی کا ذوق۔ وہ سمجھتا ہے کہ کافی پینے والا شخص اعلیٰ ذوق کا مالک اور نفاست پسند ہوتا ہے، جب کہ جو کافی پسند نہیں کرتا وہ بے ذوق ہوتا ہے۔

؎ اداس راتوں میں تیز کافی کی تلخیوں میں وہ کچھ زیادہ ہی یاد آتا ہے سردیوں میں (وصی شاہ)

مصنف کا دوست مثال دیتا ہے کہ یہی سوندھا پن لگی ہوئی کھیر اور دھنگارے ہوئے رائتے میں ہوتا ہے۔ وہ کافی کے ذائقے کو کچھ مقامی کھانوں کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے۔ لگی ہوئی کھیر اور دھنگارا رائتہ وہ چیزیں ہیں جن میں آگ یا دھوئیں کی ہلکی سی مہک شامل ہوتی ہے۔ ان میں ایک خاص سوندھی خوش بو پیدا ہو جاتی ہے جو کھانے والوں کو بھاتی ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے کہ کافی کی خوش بو بھی ایسی ہی بھینی اور دل کش ہوتی ہے۔ مصنف اس پر فوراً جواب دیتا ہے کہ مجھے ان دونوں چیزوں سے نفرت ہے جن کی تم مثال دے رہے ہو۔ اس جواب میں ایک ہلکی سی ضد بھی ہے اور مزاح بھی۔ وہ دراصل یہ کہنا چاہتا ہے کہ تمھارا ذوق اور میرا ذوق بالکل الگ ہیں۔ تم جس چیز میں لذت محسوس کرتے ہو، مجھے وہی چیز ناگوار لگتی ہے۔

؎ وہی ہے ذوق کا عالم ہزاروں نامرادی پر مگر ایسے بھی اہلِ ذوق آتے ہیں نظر کم کم (زبیر ارتضیٰ)

اس عبارت میں مصنف نے بڑی خوبی سے انسانی نفسیات کو اس مکالمے میں سمو دیا ہے۔ انسان عموماً اپنی پسند کو برتر اور دوسروں کی ناپسند کو کمتر سمجھتا ہے۔ کافی پینے والا شخص بھی یہی کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو کافی سے لطف نہیں اٹھا سکتا، وہ ذوق سے

محروم ہے۔ دوسری طرف مصنف کہتا ہے کہ اگر کسی چیز کی خوش بو اچھی لگتی ہے تو اسے پینا ضروری نہیں۔ یہ دونوں رویے دراصل انسان کی دو فطری کیفیتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

عبارت نمبر 2

فرمایا: ''تعجب ہے! یو۔ پی میں تو شرفا بڑی رغبت سے کھاتے ہیں''؛ ''میں نے اسی بنا پر ہندوستان چھوڑا۔'' چراندے ہو کر کہنے لگے: ''آپ قائل ہو جاتے ہیں تو کج بحثی کرنے لگتے ہیں۔'' جواباً عرض کیا: ''گرم ممالک میں بحث کا آغاز صحیح معنوں میں قائل ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ دانستہ دل آزاری ہمارے مشرب میں گناہ ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ کافی خوش ذائقہ ہوتی ہے تو کسی بچے کو پلا کر اس کی صورت دیکھ لیجیے۔''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے ذائقے پر ان کی اور ایک صاحب کی تکرار ہو گئی۔ مصنف نے کافی کی بو کو سگار سے تشبیہ دی تو ان صاحب نے اسے مصنف کے ذوق کی کوتاہی قرار دیا اور کافی پینے کے لیے ایک تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت پر زور دیا۔ مصنف نے طنزیہ طور پر کافی کو بطور عطر استعمال کرنے کا مشورہ دیا اور جب ان صاحب نے اسے کھیرا اور رائتے کی خوش بو سے تشبیہ دی تو مصنف نے صاف انکار کر دیا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے بارے میں رائے جاننا ان کی عاقبت نا اندیشی تھی۔ کافی کے شائقین دلیل کی بجائے ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ مصنف کافی کو میٹھا زہر اور بدمزاجی کا سبب قرار دیتے ہوئے اس کے بارے میں مبالغہ آرائیوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ ان کی بے زاری کا مطلب چائے کی حمایت نہیں، بلکہ کافی کا تجربہ اتنا ناگوار ہے کہ اب وہ ہر مشروب احتیاط سے پیتے ہیں۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی، ذہانت اور نفاست ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کی تحریر میں مزاح کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے جملے نہایت پختہ، شوخ اور تہہ دار ہوتے ہیں جو قاری کو مسکرانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

مصنف اپنے اور ایک دوست کے درمیان کافی پینے کے موضوع پر ہونے والی دل چسپ اور طنزیہ گفت گو کے بارے میں بتاتے ہیں۔ مصنف پوچھتے ہیں کہ آپ کافی کیوں پیتے ہیں، تو دوست الٹا سوال کرتے ہیں کہ آپ کیوں نہیں پیتے۔ مصنف کہتے ہیں کہ انھیں کافی میں سگار جیسی بو محسوس ہوتی ہے، جس پر دوست جواب دیتے ہیں کہ یہ ان کی ناک کی کمزوری ہے کیوں کہ کافی کی خوش بو سوندھی سوندھی ہوتی ہے۔ مصنف مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں کہ اگر خوش بو ہی پسند ہے تو کافی پینے کی بجائے اس کا عطر کشید کر لینا چاہیے تاکہ لوگ ادبی محفلوں میں لگایا کریں۔ دوست سنجیدہ ہو کر کہتے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزوں میں منطق نہیں دیکھی جاتی بلکہ ذوق اور عادت دیکھی جاتی ہے اور کافی کی خوش بو سے لطف اٹھانے کے لیے تربیت یافتہ ذوق چاہیے۔ مصنف ہنسی مذاق میں کہتے ہیں کہ انھیں کھیرا اور دھنگارے ہوئے رائتے سے بھی متلی ہوتی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتا ہے کہ میں نے ان صاحب سے معذرت کی کہ، کھرچن اور دھنگار دونوں سے مجھے متلی ہوتی ہے۔ یعنی مصنف خود ان ذائقوں سے لطف نہیں اٹھا پاتا۔ اسے ان کھانوں کی خوش بو یا ذائقہ ناگوار لگتا ہے۔ یہاں وہ اپنی ناپسندیدگی ظاہر کر رہا ہے تاکہ دکھا سکے کہ ہر ذوق ذاتی اور مخصوص ہوتا ہے۔ جو چیز ایک کے لیے خوشی کا باعث ہو، وہ دوسرے کے لیے اذیت بن سکتی ہے۔ اس بات سے انسان کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ ہم سب اپنی اپنی عادتوں، ماحول اور تربیت کے مطابق چیزوں کو پسند یا ناپسند کرتے ہیں۔ یہی انفرادی ذوق انسانی معاشرت کو رنگا رنگ بناتا ہے۔ قرآنِ مجید میں انسانوں کی مختلف

طبیعتوں، عادات اور کائنات کے تنوع کو خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (سورۃ الاسرا:84)

ترجمہ: کہہ دیجیے کہ ہر شخص اپنے طریقے (اور فطرت) کے مطابق عمل کرتا ہے۔ پس تمھارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر ہے۔"

مصنف کا دوست حیران ہو کر کہتا ہے کہ تعجب ہے! یو۔ پی میں تو شرفا یہ چیزیں بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ یو پی یعنی اتر پردیش کے لوگ کھانے پینے میں ذوق اور نزاکت کے لیے مشہور ہیں۔ وہاں کے شرفا یعنی مہذب لوگ ان کھانوں کو شوق سے کھاتے ہیں جنھیں مصنف ناپسند کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذائقہ صرف فرد کا ذاتی معاملہ نہیں، بلکہ یہ علاقائی، ثقافتی اور طبقاتی فرق سے بھی وابستہ ہوتا ہے۔ ایک علاقے کا کھانا دوسرے علاقے میں عجیب لگ سکتا ہے۔ یہی انسانی تنوع ہے جو دنیا کو مختلف رنگ دیتا ہے۔

؎ گُل ہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے (ابراہیم ذوقؔ)

مصنف اس پر ہلکے مزاحیہ انداز میں کہتا ہے کہ اس نے اسی بنا پر ہندوستان چھوڑا۔ مطلب یہ کہ وہاں کے لوگوں کا ذوق اس کے ذوق سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اس میں ہنسی بھی ہے اور تنقید بھی۔ مصنف دراصل یہ بتانا چاہتا ہے کہ بعض اوقات ذوق اور مزاج کا فرق اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے ماحول سے بیگانگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ پھر مصنف کا دوست ہنسی مذاق میں کہنے لگا کہ آپ ماننے کے بعد بھی بحث شروع کر رہے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ جب کسی بات کو سمجھ لیتے ہیں، تب بھی بحث ختم نہیں کرتے، بلکہ ضد اور انا کے باعث گفت گو کو طول دیتے ہیں۔

مصنف اس کے جواب میں کہتا ہے کہ گرم ممالک میں لوگ بحث اس وقت شروع کرتے ہیں جب وہ کسی بات کو مان لیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ بحث کا مقصد سچ کو سمجھنا نہیں بلکہ اپنی برتری ثابت کرنا ہوتا ہے۔ "گرم ممالک" کا لفظ یہاں صرف موسم کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کے مزاج کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ گرم مزاج قومیں جذباتی ہوتی ہیں، جلد مشتعل ہو جاتی ہیں اور بات کو دلیل سے زیادہ احساس کے پیمانے پر ناپتی ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ سچ کو تسلیم کرنے کے باوجود اسے قبول کرنے میں وقت لیتے ہیں کیوں کہ ہماری انا بیچ میں آ جاتی ہے۔ اپنی انا، تکبر، ضد یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے حق اور سچ کو تسلیم نہ کرنا ایک اخلاقی اور روحانی بیماری ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ

(سورۃ النمل:14)

ترجمہ: "اور انھوں نے حق کا انکار صرف ظلم اور تکبر کی وجہ سے کیا حالاں کہ ان کے دلوں کو یقین ہو چکا تھا، پس دیکھو فساد پھیلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔"

مصنف کہتا ہے کہ یہاں لوگ جان بوجھ کر کسی کا دل نہیں دکھانا چاہتے، اس لیے اپنی اصل بات یا سچی رائے چھپا لیتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے ہوش میں نہیں ہوتے، جیسے غصے یا نشے میں، تو وہی سب کچھ کہہ دیتے ہیں جو دل میں ہوتا ہے۔ ہماری تہذیب میں براہِ راست کسی کو تکلیف دینا معیوب سمجھا جاتا ہے، اس لیے ہم اپنی اصلی رائے صرف ان اوقات میں ظاہر کرتے ہیں جب خود پر قابو نہیں رہتا۔ یہ ہمارے معاشرتی نفاق پر طنز ہے۔ بظاہر ہم شائستہ نظر آتے ہیں، مگر اندر سے اپنے اصل خیالات کو چھپاتے ہیں۔

آخر میں مصنف کہتا ہے کہ اگر واقعی کافی اتنی مزیدار ہے تو کسی بچے کو پلائیں اور اس کا چہرہ دیکھیں۔ بچوں کے چہرے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ اگر کافی کا ذائقہ اچھا ہوگا تو وہ خوش ہوں گے ورنہ ان کے چہرے سے فوراً ناگواری جھلک اٹھے گی۔ یہ بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بڑے لوگ بعض اوقات بناوٹ اور دکھاوے کے باعث چیزوں کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ حقیقت میں چیز اچھی ہے یا نہیں، بلکہ اس لیے پسند کرتے ہیں کہ معاشرے میں اسے پسند کیا جاتا ہے۔ کافی، سگار، یا مخصوص کھانے اکثر فیشن

اور طبقاتی علامت بن جاتے ہیں۔ لیکن اگر سادہ فطرت انسان یا معصوم بچہ ان چیزوں کو آزمائے تو وہ انھیں ناپسند کرے گا۔ اس طرح مصنف ذائقے کے بہانے انسان کی مصنوعی پسند پر طنز کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ فطرت ہی اصل پیمانہ ہے۔ جو چیز فطری طور پر اچھی ہے، وہ ہر دل کو بھاتی ہے اور جو صرف دکھاوے کے لیے پسند کی جاتی ہے، وہ بناوٹ کے پردے کے پیچھے چھپی رہتی ہے۔

؎ جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ (قتیل شفائی)

مصنف مزید کہتا ہے کہ بچوں کا ردِعمل سب سے سچا ہوتا ہے کیوں کہ ان کے اندر بناوٹ نہیں ہوتی۔ بڑوں کے چہروں پر تاثرات مصنوعی ہوتے ہیں، مگر بچوں کے چہرے فطرت کی غمازی کرتے ہیں۔ اس لیے اگر کسی چیز کی پہچان کرنی ہو تو اسے کسی بچے کے سامنے رکھ دیں اور پھر اس کا ردِعمل دیکھ لیں۔

عبارت نمبر 3

جھلا کر بولے: ''آپ معصوم بچّوں کو بحث میں کیوں گھسیٹتے ہیں؟''

میں بھی الجھ گیا: ''آپ لوگ ہمیشہ بچوں سے پہلے لفظ معصوم کیوں لگاتے ہیں؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کچھ بچے گنہ گار بھی ہوتے ہیں؟ خیر آپ کو بچوں پر اعتراض ہے تو بلّی ہی کو لیجیے۔''

''بلّی ہی کیوں؟ بکری کیوں نہیں؟'' وہ سچ مچ مچلنے لگے۔

میں نے سمجھایا: ''بلّی اس لیے کہ جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے، بچے اور بلّیاں بُرے بھلے کی کہیں بہتر تمیز رکھتے ہیں۔''

ارشاد ہوا: ''کل کو آپ کہیں گے کہ چوں کہ بچوں اور بلیوں کو پکّے گانے پسند نہیں آسکتے اس لیے وہ بھی لغو ہیں۔''

میں نے انھیں یقین دلایا: ''میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا۔ پکّے راگ انھیں کی ایجاد ہیں۔ آپ نے بچوں کا رونا اور بلیوں کا لڑنا۔۔۔'' بات کاٹ کر بولے: ''بہر حال ثقافتی مسائل کا فیصلہ ہم بچوں اور بلّیوں پر نہیں چھوڑ سکتے۔''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ ان کی کافی کے ذائقے اور خوش بو پر مخاطب سے بحث ہوئی، جس میں اس کی مہک کو سگار کی بو سے تشبیہ دے کر طنز کیا گیا۔ جواباً اسے تربیت یافتہ ذوق کا کمال قرار دیا گیا، مگر مصنف نے اسے عطر کی طرح استعمال کرنے کا طنزیہ مشورہ دے کر مسترد کر دیا۔ روایتی کھانوں کے ذوق پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی اور کافی کے خوش ذائقہ ہونے کے دعوے کو بچوں کے ردِعمل سے پرکھنے کی تجویز دی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے بارے میں رائے جاننے کی کوشش کرنا عاقبت نا اندیشی ہے، کیوں کہ شائقین تنقید سن کر برہم ہو جاتے ہیں۔ وہ کافی کی تلخی سے بے زار ہیں اور اسے عذابِ جان مانتے ہیں۔ مصنف اس مشروب کی مقبولیت پر طنزیہ تبصرہ کرتے ہوئے اسے ایک بے کیف اور غیر معمولی شے قرار دیتے ہیں۔ کافی کے تلخ تجربات نے انھیں ہر مشروب کے معاملے میں حد درجہ محتاط بنا دیا ہے۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی، ذہانت اور نفاست ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کی تحریر میں مزاح کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے جملے نہایت پختہ، شوخ اور تہہ دار ہوتے ہیں جو قاری کو مسکرانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

مصنف اپنے دوست سے کہتا ہے کہ اگر واقعی یہ بات درست ہے کہ کافی خوش ذائقہ ہوتی ہے تو کسی بچے کو پلا کر اس کا ردِعمل دیکھ لیجیے۔ مصنف دراصل یہ کہنا چاہتا ہے کہ ''ذائقہ'' کوئی مطلق یا لازمی سچائی نہیں ہے، بلکہ یہ عادت اور تجربے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو چیز کسی بالغ انسان کو خوش ذائقہ لگتی ہے، وہی چیز ایک بچے کو بری لگ سکتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ذائقہ فطرت کی

نسبت تربیت اور عادت پر زیادہ منحصر ہے۔ مثال کے طور پر، کافی ایک تلخ مشروب ہے، لیکن دنیا بھر میں لاکھوں لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ ان کے لیے کافی کا ذائقہ خوش گوار ہوتا ہے، حالاں کہ اگر کسی بچے کو پہلی بار یہ پلائی جائے تو وہ فوراً چہرہ بگاڑ لے گا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان اپنی فطری حس کو وقت کے ساتھ بدل لیتا ہے۔

مصنف کے اس جملے پر اس کا دوست ناراض ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ بحث میں معصوم بچوں کو کیوں گھسیٹتے ہیں؟ اس پر مصنف نہایت ذہانت سے جواب دیتا ہے کہ آپ ہمیشہ بچوں سے پہلے لفظ ''معصوم'' کیوں لگاتے ہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ بچے گناہ گار بھی ہوتے ہیں؟ یہ سوال طنزیہ بھی ہے اور فکری بھی۔ مصنف دراصل زبان کے استعمال اور انسانی سوچ کی عادت کی بات کر رہا ہے۔ ہم اکثر کچھ الفاظ بغیر سوچے سمجھے استعمال کرتے ہیں۔ لفظ ''معصوم بچہ'' عام طور پر محبت یا شفقت کے اظہار کے لیے کہا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ایک غیر ضروری ترکیب ہے، کیوں کہ ہر بچہ اپنی فطرت کے لحاظ سے معصوم ہی ہوتا ہے۔

؎ دیکھو جنوں میں ان کے کھلونے نہ توڑنا تم کو رقم کریں گے یہ بچے کتاب میں (فاطمہ حسن)

جب مصنف کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دوست کو بچوں کا ذکر پسند نہیں آیا تو وہ بات کو آگے بڑھانے کے لیے کہتا ہے کہ اگر آپ کو بچوں پر اعتراض ہے تو بلّی کو مثال کے طور پر لے لیجیے۔ مخاطب فوراً اعتراض کرتا ہے کہ بلّی ہی کیوں، بکری کیوں نہیں؟ اس پر مصنف سمجھاتا ہے کہ بلّی اس لیے کہ پینے کی چیزوں میں بلّی اور بچے بہتر تمیز رکھتے ہیں۔ وہ فطری طور پر جانتے ہیں کہ کس چیز کا ذائقہ اچھا اور کس کا بُرا ہے۔

یہ بات دراصل مصنف کے بنیادی خیال کو دلیل فراہم کرتی ہے کہ فطری ذوق انسان کے تربیت یافتہ ذوق سے زیادہ سچا اور قدرتی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ بلی کو دودھ دیں تو وہ فوراً پی لے گی، لیکن اگر اسے کافی یا چائے دیں تو وہ منھ موڑ لے گی، کیوں کہ وہ فطری طور پر جانتی ہے کہ اس چیز کا ذائقہ مناسب نہیں۔ اسی طرح ایک بچہ بھی تلخ چیزوں کو فطری طور پر ناپسند کرتا ہے۔ اس کے برعکس، انسان اپنی عادت، ماحول اور معاشرتی اثرات کے زیرِ اثر ایسی چیزوں کو بھی پسند کرنے لگتا ہے جو فطرتاً ناگوار ہیں۔ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی فطری حس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

مصنف کا دوست اس بات پر طنزیہ انداز میں کہتا ہے کہ کل کو آپ یہ کہیں گے کہ چوں کہ بچوں اور بلیوں کو پکے راگ پسند نہیں آ سکتے اس لیے وہ بے کار اور فضول ہیں۔ اگر ہم بچوں اور بلیوں کو معیار بنائیں گے تو پھر تو موسیقی، فن اور تہذیبی ذوق جیسے معاملات کا فیصلہ بھی انھی کے مطابق کرنا پڑے گا۔ مصنف اس پر ناراض نہیں ہوتا بلکہ مسکراتے ہوئے جواب دیتا ہے کہ میں ایسا ہرگز نہیں کہوں گا، کیوں کہ پکے راگ تو انھی کی ایجاد ہیں۔ کیوں کہ بچے کے رونے، بلی کے لڑنے یا پرندوں کے چہچہانے میں بھی ایک مخصوص ردھم اور آہنگ ہوتا ہے۔ اگر غور سے سنا جائے تو ان میں بھی ایک طرح کا راگ پایا جاتا ہے۔ اس طرح مصنف انسانی فن اور فطرت کے درمیان تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

؎ صبح کے پرندے جب چہچہانے لگتے ہیں میرے دشت کے منظر مسکرانے لگتے ہیں (رضوان گنوری)

اب دوست بات کاٹ کر کہتا ہے کہ بہر حال ثقافتی مسائل کا فیصلہ ہم بچوں اور بلیوں پر نہیں چھوڑ سکتے۔ کیوں کہ انسان کے تہذیبی معاملات، جیسے: فن، ادب، موسیقی، ذائقہ، لباس اور اخلاق، ان سب کا فیصلہ انسانی عقل، تجربے اور شعور سے ہونا چاہیے، نہ کہ کسی حیوان یا بچے کی فطری پسند کے مطابق۔ مصنف اس بات سے براہِ راست اختلاف نہیں کرتا، بلکہ اپنی بات کے ذریعے یہ سوچ پیدا کرتا ہے کہ انسان کی عقل اور تجربہ اگر فطرت سے بالکل الگ ہو جائیں تو وہ غیر حقیقی ہو جاتے ہیں۔ مصنف کہتا ہے کہ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا، ویسے ویسے وہ فطرت سے دور ہوتا گیا۔ اس نے اپنی پسند کو فطرت کی بجائے معاشرتی معیار پر پرکھنا شروع کر دیا۔ اب وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کوئی چیز حقیقتاً اچھی ہے یا بری، بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ معاشرہ اسے کس نظر سے دیکھتا ہے۔ مثال کے طور پر کافی پینے والا شخص یہ نہیں سوچتا کہ وہ تلخ ہے، بلکہ اسے فیشن اور معیار کی علامت سمجھ کر پیتا ہے۔ یہی حال زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا بھی ہے۔

؎ زندگی نیچے کہیں منھ دیکھتی ہی رہ گئی کتنا اونچا لے گیا جینے کا معیار آدمی (ضمیر جعفری)

اس عبارت میں مصنف نے ایک عام سی بات سے ایک غیر معمولی نکتہ نکالا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ انسان کی پسند اور ناپسند ہمیشہ فطری نہیں ہوتی بلکہ وقت، معاشرت اور عادت اسے تشکیل دیتے ہیں۔ اس لیے ہمیں کبھی کبھار فطرت کے پیمانے سے بھی اپنی زندگی کو دیکھنا چاہیے، کیوں کہ سچائی اکثر سادگی میں چھپی ہوتی ہے۔ یہ تحریر قاری کو ہنسی کے ساتھ ساتھ ایک فکری روشنی بھی عطا کرتی ہے۔

عبارت نمبر 4

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مگر یہ واقعہ ہے کہ جب بھی میں نے کافی کے بارے میں استصوابِ رائے عامہ کیا اس کا انجام اسی قسم کا ہوا۔ شائقین میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹی جرح کرنے لگتے ہیں۔ اب میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسارِ رائے عامہ کرنا بڑی عاقبت نااندیشی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بدمذاقی ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا۔ زندگی میں صرف ایک شخص ایسا ملا جو واقعی کافی سے بے زار تھا لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے زیادہ قابلِ التفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔ ایک صاحب اپنی پسند کے جواز میں صرف یہ کہہ کر چپ ہو گئے کہ: چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافی لگی ہوئی

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے ذائقے پر ہونے والی ایک دل چسپ بحث میں ان کا سامنا ایک ایسے کافی نوش سے ہوا جو اس کی مہک کو سوندھی خوش بو قرار دے کر نفیس ذوق کا تقاضا ٹھہراتا ہے۔ بحث کا یہ سلسلہ کھانوں، معاشرتی عادات اور بالآخر بچوں اور بلیوں کے ذوق تک جا پہنچتا ہے۔ بچے اور جانور ذائقے میں انسانوں سے زیادہ دیانت دار ہوتے ہیں، جب کہ مخاطب اسے محض کج بحثی قرار دیتا ہے۔ اس شگفتہ مکالمے میں ثقافتی مسائل کو خوب صورتی سے سمویا گیا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ کافی سے ان کی بے زاری کسی محرومی کا نہیں بلکہ تجربے کا نتیجہ ہے۔ وہ کافی کے شائقین کے مضحکہ خیز دلائل اور اس کی نام نہاد خوبیوں پر گہرا طنز کرتے ہوئے اسے میٹھا زہر قرار دیتے ہیں۔ کافی ہاؤسز کی فضا اور اس کی تیاری کے عجیب طریقوں پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ اسے ایک ایسا عذاب مانتے ہیں جس کا عادی شخص ہر گرم مشروب پھونک پھونک کر پیتا ہے۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی، ذہانت اور نفاست ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کی تحریر میں مزاح کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے جملے نہایت پختہ، شوخ اور تہہ دار ہوتے ہیں جو قاری کو مسکرانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

مصنف کہتا ہے کہ اس نے اپنے دوست کو یقین دلانے کی خاطر کہا کہ وہ کچھ باتوں میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر، پکے راگ یا کلاسیکی موسیقی ان لوگوں کی ایجاد ہیں جو اس فن کے ماہر ہیں۔ مصنف کا مطلب یہ تھا کہ وہ خود موسیقی کے میدان کا ماہر نہیں، اس لیے وہ اس کے بارے میں فیصلہ کرنے یا تبصرہ کرنے کا اہل نہیں۔ مگر مصنف کے دوست نے فوراً بات کاٹ کر کہا کہ ایسے ثقافتی معاملات کا فیصلہ بچوں یا بلیوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یعنی وہ کہنا چاہتا تھا کہ موسیقی، فن یا ثقافت کے بارے میں رائے دینے کے لیے علم اور سمجھ بوجھ کا ہونا ضروری ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف اپنے دوست سے کہتا ہے کہ چاہے آپ کو یقین آئے یا نہ آئے، لیکن اس نے کافی کے بارے میں لوگوں سے رائے لی، نتیجہ ہمیشہ عجیب نکلا۔ لوگ اس کے سوال کا سیدھا جواب دینے کی بجائے اُلٹا بحث شروع کر دیتے ہیں۔ وہ اس سے سوال کرنے لگتے ہیں کہ تمھیں کافی کیوں نہیں پسند؟ یا تمھاری پسند کا معیار کیا ہے؟ یعنی وہ اصل سوال سے ہٹ کر

بات کو الجھا دیتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کافی کے بارے میں عوام سے رائے لینا ویسے ہی ناسمجھی ہے جیسے کسی نازک یا ذاتی موضوع پر غیر ضروری سوال کرنا۔ کافی یا کلاسیکی موسیقی کے بارے میں رائے لینا بڑی عاقبت نااندیشی ہے، کیوں کہ یہ دونوں چیزیں صرف مشروب یا فن نہیں بلکہ ذاتی ذوق اور عادت کا حصہ بن چکی ہیں۔ ان کے بارے میں جب کسی سے پوچھا جاتا ہے تو لوگ جذباتی ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی پسند کا دفاع کرنے لگتے ہیں، گویا ان پر حملہ کر دیا گیا ہو۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے آپ کسی نیک مرد سے اس کی آمدنی پوچھیں یا کسی خوب صورت عورت سے اس کی عمر معلوم کریں۔ ایسے سوالات معاشرتی لحاظ سے ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں۔

؎ کچھ کٹی ہمتِ سوال میں عمر کچھ امیدِ جواب میں گزری (فانی بدایونی)

؎ وہ لاجواب ہوگئے میرے سوال پر آخر دیا جواب کہ اچھا سوال ہے (خواجہ محمد زکریا)

اگرچہ نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر پوچھنا خطرے سے خالی نہیں، لیکن کافی یا موسیقی پر رائے لینا اس سے بھی زیادہ بدذوقی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ ان چیزوں کے بارے میں اتنے حساس ہیں کہ ان پر بات کرنا اکثر ناراضی یا بحث کا سبب بن جاتا ہے۔ پھر مصنف بتاتا ہے کہ اسے زندگی میں صرف ایک شخص ایسا ملا جو واقعی کافی سے بیزار تھا۔ لیکن اس کی رائے بھی اس کے نزدیک معتبر نہیں، کیوں کہ وہ شخص خود ایک کافی ہاؤس کا مالک تھا۔ یعنی وہ کافی کو پسند نہیں کرتا تھا مگر اس کا کاروبار کافی سے ہی چلتا تھا۔ بہت سے لوگ بظاہر کسی چیز سے نفرت یا بے زاری ظاہر کرتے ہیں، مگر درحقیقت ان کا مفاد اسی چیز سے وابستہ ہوتا ہے۔

ایک اور شخص نے اپنی کافی سے محبت کا جواز دیتے ہوئے بس اتنا کہا: ''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافی لگی ہوئی۔'' اس ایک مصرعے میں اس نے اپنی عادت، شوق اور کمزوری سب کچھ بیان کر دیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ آخر ایسا کیوں ہے، تو اس نے سادہ سا جواب دیا: ''یہ دراصل عادت کی بات ہے۔'' دراصل اکثر چیزیں عقل یا دلیل سے نہیں بلکہ عادت کے باعث پسندیدہ یا ناپسندیدہ بن جاتی ہیں۔ انسان بار بار کسی عمل کو دہراتا ہے تو وہ اس کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے اور پھر اس کے بغیر وہ خود کو ادھورا محسوس کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کافی پینے کا شوق عقل یا ذوق سے زیادہ عادت کا نتیجہ ہے۔ کچھ لوگ دن کا آغاز کافی کے بغیر نہیں کر سکتے، ان کے لیے یہ مشروب ایک ضرورت بن جاتا ہے۔ لہٰذا جب ان سے کوئی اس کے بارے میں رائے مانگتا ہے تو وہ اسے ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں اور بحث شروع کر دیتے ہیں۔

؎ ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفت گو کیا ہے (غالبؔ)

مصنف مزید بتاتا ہے کہ انسانی رویّے اکثر غیر منطقی ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی پسند کے بارے میں اتنے جذباتی ہو جاتے ہیں کہ کوئی دوسرا شخص اگر اس پر سوال کرے تو وہ اسے اپنی توہین سمجھ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ کافی یا موسیقی پر عوامی رائے لینا بے وقوفی ہے۔ کیوں کہ ان موضوعات پر لوگ دلیل کی بجائے جذبات سے کام لیتے ہیں۔ اگر اس بات کو زندگی کے عام پہلوؤں سے جوڑا جائے تو یہی صورتِ حال اکثر دوسری چیزوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً، کوئی شخص مخصوص کھانے، لباس یا کسی فن کے بارے میں پسند یا ناپسند رکھتا ہے۔ اگر اس کی پسند پر تنقید کی جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے، حالاں کہ یہ صرف ذاتی ذوق کا معاملہ ہوتا ہے۔ مصنف نے کافی کے حوالے سے یہی انسانی کمزوری اجاگر کی ہے۔

مختصر یہ کہ انسان کی پسند و ناپسند کا دائرہ بہت ذاتی ہوتا ہے۔ اس میں مداخلت یا سوال انسان کو ناگوار گزرتا ہے۔ لہٰذا عقل مندی اسی میں ہے کہ ہم دوسروں کے ذوق اور عادات کو ان کا ذاتی معاملہ سمجھیں، ان پر بحث یا تنقید نہ کریں۔ یہ تحریر بظاہر مزاحیہ ہے مگر اپنے اندر انسانی نفسیات، معاشرتی آداب اور روزمرہ زندگی کے رویّوں کا نہایت خوب صورت تجزیہ سمیٹے ہوئے ہے۔

عبارت نمبر 5

بعض احباب تو اس سوال سے چراغ پا ہو کر ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جھوٹے الزام کو سمجھ دار آدمی نہایت اعتماد سے ہنس کر ٹال دیتا ہے، مگر سچے الزام سے تن بدن میں آگ لگ

جاتی ہے۔ اس ضمن میں جو متضاد باتیں سننا پڑتی ہیں، ان کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ ایک کرم فرما نے میری بے زاری کو محرومی پر محمول کرتے ہوئے فرمایا: ''ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔''

ان کی خدمت میں حلفیہ عرض کیا کہ دراصل بیسیوں گیلن کافی پینے کے بعد ہی یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ دوسرے صاحب نے ذرا کھل کر پوچھا کہ کہیں کافی سے چڑ کی اصل وجہ معدے کے وہ داغ (Ulcers) تو نہیں جن کو میں دو سال سے لیے پھر رہا ہوں اور جو کافی کی تیزابیت سے جل اٹھتے ہیں اور اس کے بعد وہ مجھے نہایت تشخیص ناک نظروں سے گھورنے لگے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے شوقین افراد سے اس کے ذائقے پر سوال کرنا ہمیشہ لاحاصل بحث کو جنم دیتا ہے۔ کافی کی بو کو سگار جیسا کہنے پر اسے تربیت یافتہ ذوق کی خوش بو قرار دیا جاتا ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ منطق سمجھ سے باہر ہے کہ جو چیز ناک کو پسند ہو، اسے حلق میں انڈیلنا ضروری ہے۔ کافی نوش دلیل ہارنے پر بچوں اور ثقافت کے نام پر کج بحثی کرتے ہیں۔ آخر کار مصنف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کافی پر رائے مانگنا نجی معاملات میں مداخلت جیسی بد مذاقی ہے؛ دراصل لوگ کافی کے ذائقے کی بجائے اس کی عادت کے اسیر ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ قدرت کی ہر شے میں حکمت ہے، اسی تناظر میں وہ کافی کے سماجی رواج پر طنز کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کافی پینا ایک عذاب ہے جسے لوگ محض فیشن یا دانش ور بننے کے لیے جھیلتے ہیں۔ وہ کافی کی تلخی اور اس کی تیاری کے مضحکہ خیز طریقوں پر طنزیہ تبصرہ کرتے ہیں۔ آخر میں مصنف واضح کرتے ہیں کہ کافی سے بے زاری کا مطلب چائے سے لگاؤ نہیں، بلکہ اس کی تلخی نے انھیں بہت محتاط بنا دیا ہے۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی، ذہانت اور نفاست ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کی تحریر میں مزاح کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے جملے نہایت پختہ، شوخ اور تہہ دار ہوتے ہیں جو قاری کو مسکرانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

مصنف بتاتا ہے کہ جب بھی وہ کافی کے بارے میں عوام کی رائے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو لوگ سیدھا جواب دینے کی بجائے اس سے الٹے سوالات کرنے لگتے ہیں۔ اس کے تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی جیسے موضوعات پر عوام کی رائے لینا عاقبت نا اندیشی ہے، کیوں کہ لوگ ان چیزوں سے ذاتی اور جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ اس بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہے کہ کسی نیک آدمی کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر پوچھنا بھی بد ذوقی اور غیر مناسب ہے۔ وہ مزید بتاتا ہے کہ اسے صرف ایک شخص ملا جو کافی سے بے زار تھا، لیکن وہ خود ایک کافی ہاؤس کا مالک نکلا، اس لیے اس کی رائے معتبر نہیں تھی۔ ایک اور شخص نے اپنی کافی سے محبت کا یہ کہہ کر اظہار کیا کہ ''چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافی لگی ہوئی''، یعنی یہ عادت اور رغبت کا معاملہ ہے، نہ کہ صرف ذائقے کا۔ بقول غالب:

؎ وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے (غالب)

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتا ہے کہ کچھ لوگ تو کافی کے بارے میں گفت گو کرتے ہوئے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ جب وہ اپنی کافی سے بے زاری کا ذکر کرتا ہے تو بعض لوگ اس پر خفا ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، مگر یہ ضرور ہے کہ ان کے ردِ عمل میں غیر ضروری شدت ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سمجھ دار آدمی جھوٹے الزام کو ہنس کر ٹال دیتا ہے، کیوں کہ جھوٹ میں چبھن نہیں ہوتی۔ لیکن جب کوئی سچی بات کہی جائے تو انسان کے اندر آگ لگ جاتی ہے، کیوں کہ سچ ہمیشہ چبھتا ہے۔ انسان وہ بات برداشت نہیں کر پاتا جو اس کی کمزوری یا حقیقت کو ظاہر کر دے۔ جب کوئی جھوٹی بات سنے تو وہ مطمئن رہتا ہے کیوں

کہ وہ جانتا ہے کہ اس میں حقیقت نہیں، مگر جب کوئی بات سچ ہو تو وہ دل کے اندر تک اُتر جاتی ہے اور انسان کا سکون چھین لیتی ہے۔

؎ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے (علامہ اقبالؒ)

مصنف دو مثالیں دیتا ہے کہ کس طرح لوگ کافی سے ناپسندیدگی پر مختلف انداز میں ردِ عمل دیتے ہیں۔ ایک صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا: ''ہائے کم بخت! تو نے پی ہی نہیں۔'' ان کے خیال میں مصنف کافی سے اس لیے بیزار ہے کیوں کہ اس نے کبھی اچھی کافی پی ہی نہیں۔ گویا وہ سمجھتے ہیں کہ اگر مصنف ایک مرتبہ اصل ذائقہ چکھ لے تو اس کی رائے فوراً بدل جائے گی۔ اس پر مصنف نے نہایت برجستہ اور مزاحیہ جواب دیا کہ ''میں نے تو بیسیوں گیلن کافی پی ہے، تب جا کر یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔'' اس جواب میں ایک طرح کا طنز بھی ہے۔ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ میری ناپسندیدگی لاعلمی یا محرومی کی وجہ سے نہیں بلکہ تجربے کی بنیاد پر ہے۔ یعنی میں نے کافی کو خوب آزمایا ہے، اس کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا کہ یہ مجھے پسند نہیں۔ یہاں مصنف کے الفاظ میں خود اعتمادی بھی ہے اور شائستہ طنز بھی۔ وہ کسی کو برا نہیں کہتا، بلکہ اپنی بات کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ پڑھنے والا محظوظ بھی ہو اور بات کا مفہوم بھی سمجھ جائے۔ سلیقے اور تہذیب سے کی گئی بات کا اثر ہوتا ہے اس لیے الفاظ میں شائستگی اور لہجے میں نرمی اختیار کرنی چاہیے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

''نرمی جس چیز میں بھی ہوتی ہے اس کو زینت بخش دیتی ہے اور جس چیز سے نرمی نکال دی جاتی ہے اُسے بدصورت کر دیتی ہے''
(صحیح مسلم حدیث نمبر: 6602)

اور بقول شاعر:

؎ ایک پتھر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے — شرط یہ ہے کہ سلیقے سے تراشا جائے (منظور ندیم)

نفرت کی وجہ معدے کے زخم تو نہیں؟ یعنی وہ یہ سمجھتا تھا کہ کافی کی تیزابیت نے مصنف کے معدے کو متاثر کیا ہوگا، اس لیے وہ کافی کو پسند نہیں کرتا۔ مصنف کہتا ہے کہ سوال کرنے کے بعد وہ شخص اسے اس طرح گھورنے لگا جیسے کسی ڈاکٹر کی طرح بیماری کی تشخیص کر رہا ہو۔ یہ منظر نہایت مزاحیہ ہے، مگر اس کے اندر ایک نفسیاتی سچائی چھپی ہے۔ لوگ اکثر دوسروں کی پسند یا ناپسند کو بیماری یا کمزوری سے جوڑ دیتے ہیں۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ کوئی چیز محض ذوق یا تجربے کی بنیاد پر بھی ناپسند کی جا سکتی ہے۔ درحقیقت ہمارے معاشرے میں لوگوں کو دوسروں کی رائے یا پسند و ناپسند کا احترام کرنے کا سلیقہ نہیں۔ اگر کسی کو وہ چیز پسند نہیں جو ہمیں پسند ہے، تو ہم فوراً یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ضرور اس میں کوئی کمی ہے یا وہ شخص محروم یا بیمار ہے۔

اس عبارت میں مصنف کافی کے بہانے انسانی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو بیان کر رہا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ بات کہ انسان کی پسند و ناپسند کا اکثر اس کی عادت سے تعلق ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ لوگ اختلافِ رائے برداشت نہیں کرتے۔ تیسرا یہ کہ انسان جھوٹ سے زیادہ سچ سے تنگ ہوتا ہے۔ اور چوتھا یہ کہ لوگ اکثر دوسروں کی بات کو ان کے ذاتی تجربے کی بجائے کسی کمزوری یا محرومی سے جوڑتے ہیں۔ دراصل زندگی میں دوسروں کے ذوق، عادت اور رائے کا احترام کرنا ضروری ہے۔ ہر شخص کا تجربہ مختلف ہوتا ہے اور ہر انسان کی پسند کا معیار الگ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کافی سے محبت کرتا ہے تو یہ اس کی اپنی پسند ہے اور اگر کوئی اس سے بے زار ہے تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہمیں اس بات پر کسی کا مذاق نہیں بنانا چاہیے اور نہ ہی کسی کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ ہماری پسند کو اپنی پسند بنائے۔

؎ ملی گل کو خوش بو، مجھے مل گیا تو — پسند اپنی اپنی، نصیب اپنا اپنا

مصنف کے بیان میں ''عادت'' کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، وہ انسانی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ عادت ایک ایسی قوت ہے جو انسان کے فیصلوں کو متاثر کرتی ہے۔ بعض اوقات ہم کسی چیز کو صرف اس لیے اچھا سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ کافی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ یہ ذائقہ نہیں بلکہ عادت ہے جو لوگوں کو کافی کا دیوانہ بنا دیتی ہے۔ اسی طرح مصنف کے ''جھوٹ اور سچ'' کے جملے میں بھی انسانی فطرت کی گہرائی جھلکتی ہے۔ وہ یہ دکھاتا ہے کہ انسان اکثر ظاہری باتوں پر ہنستا ہے مگر جب کوئی بات دل کی گہرائیوں کو چھو لے تو برداشت نہیں کر پاتا۔

عبارت نمبر 6

استصوابِ رائے عامہ کا حشر آپ دیکھ چکے۔ اب مجھے اپنے تاثرات پیش کرنے کی اجازت دیجیے۔ میرا ایمان ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کوئی شے بے کار نہیں۔ انسان غور و فکر کی عادت ڈالے (یا محض عادت ہی ڈال لے) تو ہر بری چیز میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور نکل آتی ہے۔ مثال کے طور پر حقے ہی کو لیجیے۔ معتبر بزرگوں سے سنا ہے کہ حقہ پینے سے تفکرات پاس نہیں پھٹکتے۔ بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ اگر تمباکو خراب ہو تو تفکرات ہی پر کیا موقوف ہے، کوئی بھی پاس نہیں پھٹکتا۔ اب دیگر ملکی اشیائے خورونوش پر نظر ڈالیے۔ مرچیں کھانے کا ایک آسانی سے سمجھ آجانے والا فائدہ یہ ہے کہ ان سے ہمارے مشرقی کھانوں کا اصل رنگ اور مزا دب جاتا ہے۔ خمیرہ گاؤزبان اس لیے کھاتے ہیں کہ بغیر راشن کارڈ کے شکر حاصل کرنے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ جوشاندہ اس لیے گوارا ہے کہ اس سے نہ صرف ایک ملکی صنعت کو فروغ ہوتا ہے بلکہ نفسِ امارہ کو مارنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ شلغم اس لیے زہر مار کرتے ہیں کہ ان میں وٹامن ہوتا ہے لیکن جدید طبی ریسرچ نے ثابت کر دیا ہے کہ کافی میں سوائے کافی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اہلِ ذوق کے نزدیک یہی اس کی خوبی ہے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے بارے میں استفسار ہمیشہ ایک تلخ اور بے نتیجہ بحث ثابت ہوتا ہے۔ کافی کے شوقین معقول جواز دینے کی بجائے اکثر جذباتی ہو کر ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک کافی پر رائے مانگنا عاقبت نااندیشی ہے جو کسی کی آمدنی پوچھنے جیسی بدمذاقی ہے۔ ان کی مخالفت پر لوگ اکثر انھیں محرومی کا طعنہ دیتے ہیں یا اسے معدے کے عارضے کا نتیجہ قرار دے کر طبی تشخیص کی کوشش کرتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کی دریافت تاریخ کا ایک معمہ ہے جس سے قدیم یونانی ناواقف تھے۔ وہ طنزیہ انداز میں کافی کے بڑھتے رجحان اور کافی ہاؤسز کے جمگھٹوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے میٹھا زہر قرار دیتے ہیں۔ مصنف کافی کے تلخ ذائقے کو اپنی طبیعت کے خلاف سمجھتے ہیں اور اسے پینا ایک عذاب تصور کرتے ہیں۔ آخر میں وہ واضح کرتے ہیں کہ ان کی اس مشروب سے بے زاری کافی کے تلخ تجربات کا نتیجہ ہے۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی، ذہانت اور نفاست ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کی تحریر میں مزاح کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے جملے نہایت پختہ، شوخ اور تہہ دار ہوتے ہیں جو قاری کو مسکرانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف نے معاشرتی رویّوں، انسانی عادتوں اور چیزوں کے بارے میں غیر منطقی تاویلات پر لطیف انداز میں تنقید کی ہے۔ اس میں خاص طور پر یہ دکھایا گیا ہے کہ انسان اکثر اپنی پسندیدہ یا ناپسندیدہ چیزوں کے لیے کس طرح عجیب و غریب دلیلیں تلاش کر لیتا ہے۔ مصنف اپنی بات رائے عامہ یعنی عوام کی رائے کے ذکر سے شروع کرتا ہے اور آخر میں کافی کی مثال دے کر بات کو نہایت دل چسپ انداز میں سمیٹتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے پہلے ہی لوگوں کے رجحانات اور رائے عامہ کی کیفیت دیکھ لی ہے۔ رائے عامہ کا معیار اتنا کمزور اور سطحی ہے کہ اس کا انجام یا نتیجہ کسی قیامت سے کم نہیں۔ اس کے بعد مصنف اپنے تاثرات پیش کرتا ہے۔

مصنف کہتا ہے کہ میرا ایمان ہے کہ قدرت نے ہر شے کو کسی نہ کسی مقصد کے لیے بنایا ہے اور کوئی چیز مکمل طور پر بے کار نہیں ہے۔ اگر انسان غور و فکر کی عادت ڈالے یا کم از کم عادت ڈالنے کی کوشش کرے تو وہ ہر بری چیز میں بھی کوئی نہ کوئی خوبی تلاش کر سکتا ہے۔ اس سے مصنف انسانی فطرت پر طنز کر رہا ہے کہ ہم اپنی پسند یا عادت کو درست ثابت کرنے کے لیے کسی بھی شے میں خوبی تلاش کر لیتے

ہیں، چاہے وہ خوبی واقعی موجود ہو یا محض ہماری سوچ کی پیداوار ہو۔ پہلی مثال حقے کی ہے۔ معتبر بزرگوں سے سنا گیا ہے کہ حقہ پینے سے انسان کے تفکرات یعنی ذہنی پریشانیاں کم یا ختم ہو جاتی ہیں۔ یعنی لوگ اپنی بری عادت کو بھی خوبی کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

؎ آدمی جان کے کھاتا ہے محبت میں فریب خود فریبی ہی محبت کا صلہ ہو جیسے (اقبال عظیم)

مصنف اس بات کو مزید دل چسپ بنانے کے لیے کہتا ہے کہ اگر تمباکو خراب ہو جائے تو پھر نہ صرف تفکرات بلکہ کوئی بھی ''پاس'' نہیں آتا۔ اس مثال میں طنزیہ ہے کہ لوگ اپنی بری عادت یا شوق کو جواز دینے کے لیے مضحکہ خیز دلائل بھی تراشتے ہیں۔ اس کے بعد مصنف اشیائے خورونوش یعنی کھانے پینے کی چیزوں کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مرچیں کھانے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے مشرقی کھانوں کا اصل ذائقہ دب جاتا ہے۔ مرچیں کھانے سے کھانے کا ذائقہ تیز ہو جاتا ہے اور اصل ذائقہ محسوس نہیں ہوتا، مگر لوگ اس نقصان کو بھی خوبی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہاں مصنف انسانی رویّوں پر لطیف طنز کر رہا ہے کہ ہم اکثر نقصان کو بھی کسی اچھائی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ رویہ درست نہیں۔ اسلام ہمیں حقیقت پسندی کی تعلیم دیتا ہے اور ہمیشہ حق و باطل میں تمیز کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (سورۃ البقرہ:42)

ترجمہ: ''اور سچ میں جھوٹ نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ حالاں کہ تم جانتے ہو۔''

پھر خمیرۂ گاؤزبان کی مثال دی گئی ہے، جو ایک خوراک ہے جس میں چینی شامل ہوتی ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ لوگ خمیرۂ گاؤزبان اس لیے کھاتے ہیں کہ یہ بغیر راشن کارڈ کے شکر حاصل کرنے کا ایک جائز طریقہ ہے۔ اس میں ایک سماجی حقیقت بھی چھپی ہوئی ہے کہ پاکستان میں پانچ چھ دہائیوں پہلے عام آدمی کو چینی صرف راشن کارڈ پر ملتی تھی۔ لوگ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے غیر رسمی طریقے بھی اختیار کرتے ہیں۔ مصنف اس حقیقت کو مزاحیہ انداز میں بیان کرتا ہے کہ انسان اپنی ضروریات کے لیے کیسی کیسی دلیلیں اور جواز تیار کر لیتا ہے۔

اسی طرح ''جوشاندہ'' کی مثال دی گئی ہے، جو عموماً ذائقے میں خوش گوار نہیں ہوتا، لیکن اسے صحت کے لیے مفید سمجھا جاتا ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ لوگ جوشاندہ پیتے ہیں کہ اس سے ایک ملکی صنعت کو فروغ ملتا ہے اور ساتھ ہی نفسِ امارہ یعنی برے رجحانات کو قابو میں رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ طنزیہ ہے کہ جوشاندہ کا ذائقہ اتنا خراب ہوتا ہے کہ انسان خود بخود دنیاوی لذتوں سے دور ہو جاتا ہے، اور نتیجتاً برے خیالات اور خواہشات کم ہو جاتی ہیں۔ یہاں مصنف انسانی کمزوری اور رویے پر مزاحیہ تنقید پیش کرتا ہے کہ ہم نقصان کو بھی فائدے کے طور پر قبول کرنے میں ماہر ہیں۔ اسی طرح شلغم کی مثال پیش کی گئی ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ لوگ شلغم اس لیے کھاتے ہیں کہ اس میں وٹامن موجود ہیں، حالاں کہ زیادہ تر لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔ یہاں بھی طنزیہ ہے کہ ہم اپنی صحت یا فائدے کے لیے ناپسندیدہ چیزوں کو جواز کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔ شلغم کی مثال یہ بتاتی ہے کہ انسان اپنی عادت، ضرورت یا سماجی تقاضوں کے مطابق کسی چیز کو قبول کرنے کے لیے ہمیشہ کوئی نہ کوئی منطقی یا غیر منطقی دلیل تلاش کرتا ہے۔

؎ فقیہہ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں (فیض)

آخر میں مصنف کہتا ہے کہ جدید طبی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ کافی میں سوائے کافی کے کچھ نہیں ہوتا، یعنی اس میں کوئی وٹامن یا طبی فائدہ نہیں ہے۔ مگر اہلِ ذوق کے نزدیک یہی کافی کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ یہ خالص ہے اور اس میں کسی چیز کی ملاوٹ نہیں ہوئی۔ اس مثال میں طنز اور حقیقت دونوں شامل ہیں۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان بعض اوقات کسی چیز کی خوبی اس کے نقص میں بھی تلاش کر لیتا ہے اور اپنے شوق کو منطقی جواز کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔

اس عبارت میں مصنف کا انداز بیان بہت دل کش اور ہلکا پھلکا ہے، جس میں طنز اور حقیقت کا حسین امتزاج موجود ہے۔ مثالوں کے ذریعے اس نے واضح کیا کہ انسان ہر چیز میں اپنی فطرت کے مطابق معنی تلاش کرتا ہے۔ کبھی کسی بری عادت میں

خوبی تلاش کر لیتا ہے، کبھی کسی نقصان میں فائدہ نکال لیتا ہے۔ مرچیں، خمیرۂ گاؤزبان، جوشاندہ، شلغم اور کافی کی مثالیں انسانی فطرت کے اس رجحان کو نمایاں کرتی ہیں۔ پسند اور ناپسند کے حوالے سے قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو نصیحت فرمائی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے حق میں بہتر ہو اور عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے نقصان دہ ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔'' (سورۃ البقرہ:216)

عبارت نمبر 7

معلوم نہیں کافی کیوں، کب اور کس مردم آزار نے دریافت کی لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یونانیوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ اگر انھیں ذرا بھی علم ہوتا تو چرائتہ کی طرح یہ بھی یونانی طب کی جُزوِ اعظم ہوتی۔ اس قیاس کو اس امر سے مزید تقویت ہوتی ہے کہ قصبوں میں کافی کی بڑھتی ہوئی کھپت کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عطائیوں نے ''اللہ شافی، اللہ کافی'' کہ کر مؤخرالذکر کا سفوف اپنے نسخوں میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس قسم کی جڑی بوٹیوں کا استعمال عداوت اور عقدِ ثانی کے لیے مخصوص تھا۔ چوں کہ آج کل ان دونوں باتوں کو معیوب خیال کیا جاتا ہے، اس لیے صرف اظہارِ خلوصِ باہمی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے متعلق رائے مانگنا بحث و تکرار اور ذاتی حملوں کو دعوت دینا ہے۔ شائقین اس پر تنقید سننے کی بجائے الٹی جرح کرتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک اس موضوع پر استفسار کرنا کسی کی ذاتی زندگی پر سوال اٹھانے جیسا ہے۔ لوگ مصنف کی بے زاری کو لاعلمی یا بیماری سے جوڑتے ہیں۔ مصنف طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر چیز مفید ہے، مگر کافی ایک ایسی شے ہے جس میں سوائے کافی کے کچھ نہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے بارے میں ان کے خیالات مزاحیہ اور طنزیہ ہیں۔ وہ کافی کو ایک ناگوار اور تلخ شے قرار دیتے ہیں جس کا ذائقہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ کافی کے عادی افراد کی قوتِ برداشت کو سراہتے ہوئے انھیں اہلِ جنت قرار دیتے ہیں۔ مصنف کافی ہاؤس کے کلچر پر بھی طنز کرتے ہیں۔ آخر میں وہ واضح کرتے ہیں کہ ان کی کافی سے بے زاری کا مطلب چائے کی طرف داری نہیں ہے۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی، ذہانت اور نفاست ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کی تحریر میں مزاح کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے جملے نہایت پختہ، شوخ اور تہہ دار ہوتے ہیں جو قاری کو مسکرانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کافی کی تاریخ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انھیں یہ تو نہیں معلوم کہ کافی کو کس نے اور کب ایجاد کیا، لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ قدیم یونانیوں کو اس مشروب کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ اگر یونانیوں کو کافی کے بارے میں ذرا بھی علم ہوتا تو وہ اسے اپنی قدیم طب (یونانی دواؤں) میں اسی طرح شامل کر لیتے جیسے کہ وہ کڑوی اور افادیت والی جڑی بوٹی ''چرائتہ'' کا استعمال کرتے تھے۔ یہاں مصنف کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ کافی جس طرح آج ہر خاص و عام میں مقبول ہے، اسے طبی نقطۂ نظر سے بھی بہت اہمیت حاصل ہو جاتی۔

؎ اداس راتوں میں تیز کافی کی تلخیوں میں وہ کچھ زیادہ ہی یاد آتا ہے سردیوں میں (وصی شاہ)

اس کے بعد مصنف کافی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت پر ایک بڑا مزیدار اور طنزیہ تبصرہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ آج کل کے نیم حکیموں یا عطائیوں نے کافی کی بڑھتی ہوئی طلب کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے نسخوں میں شامل کر لیا ہے۔ وہ ایسا ایک مذہبی اور

روحانی جملے ''اللہ شافی، اللہ کافی'' کی آڑ میں کرتے ہیں۔ اس جملے کا اصل مطلب تو اللہ کی ذات پر بھروسا اور شفا کا طالب ہونا ہے، جس میں ''کافی'' کا مطلب ''کفایت کرنے والا'' ہے، لیکن عطائی حضرات نے اس میں موجود لفظ ''کافی'' کو مشروب کے معنی میں لے کر لوگوں کو اس کے استعمال کا مشورہ دینا شروع کر دیا ہے۔ یہ مصنف کا بہترین طنزیہ وار ہے، جس میں وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی جہالت اور چیزوں کو غلط معنوں میں استعمال کرنے کے رجحان کو بے نقاب کر رہے ہیں۔

؎ کل بازار میں بھیا شافی پینے آئے ٹھنڈی کافی (احمد حاطب صدیقی)

تشریح طلب عبارت میں مصنف مزید پرانے زمانے کے رسم و رواج اور جڑی بوٹیوں کے استعمال پر تبصرہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں کچھ خاص قسم کی جڑی بوٹیاں صرف دشمنی نکالنے یا پھر دوسری شادی (عقدِ ثانی) کے لیے استعمال کی جاتی تھیں، یعنی ایسی جڑی بوٹیاں جو کسی کو زیر کرنے یا اپنے قابو میں لانے کے لیے کارآمد سمجھی جاتی تھیں۔ مصنف یہاں ایک سماجی طنز کر رہے ہیں کہ پرانے وقتوں میں لوگ ان چیزوں کو منفی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے، مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ آج کے دور میں نہ تو لوگ کھلم کھلا دشمنی کرنا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی دوسری شادی کے لیے ٹوٹکوں کا سہارا لیتے ہیں کیوں کہ اب سماج میں ان دونوں چیزوں کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔

؎ جسے دیکھو وہی ہے دوسری بیوی کے چکر میں غنیمت ہے موحد جو یہاں دو چار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے شیخ! ہم یوں ہی بھلے، چل راہ لگ اپنی تجھے تو بیویاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں (اے۔ ڈی اعظم)

اس تبدیلی کے بعد اب کافی کا استعمال ایک بالکل مختلف مقصد کے لیے ہوتا ہے، اور وہ مقصد ہے ''اظہارِ خلوص''۔ آج کے دور میں کافی پلانا یا کافی پیتے ہوئے وقت گزارنا دو افراد کے درمیان دوستی، محبت اور خلوص کی علامت بن چکا ہے۔ مصنف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو چیز کبھی کسی کو قابو کرنے یا نقصان پہنچانے کے لیے استعمال کی جاتی تھی، آج وہی کافی ایک ایسا مہذب اور شائستہ مشروب بن چکی ہے جو لوگوں کے دلوں کو جوڑتی ہے۔

مختصراً یہ کہ مصنف نے اس عبارت کے ذریعے کافی کی تاریخ، اس کی طبی اہمیت، عطائیوں کے ہاتھوں اس کے غلط استعمال اور جدید دور میں سماجی تعلقات میں اس کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو بہت ہی سادہ مگر مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ چیزیں وہی رہتی ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے استعمال کے طریقے اور معاشرتی سوچ بدل جاتی ہے۔ کافی کا مشروب، جو شاید کبھی کوئی معمولی چیز رہا ہوگا، آج ہمارے سماجی آداب اور میل ملاپ کا ایک ناگزیر حصہ بن چکا ہے۔ مصنف کا یہ اندازِ بیان نہ صرف قاری کو مسکرانے پر مجبور کرتا ہے بلکہ انہیں معاشرے کی بدلتی ہوئی اقدار اور لوگوں کے رویوں پر غور کرنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ ان کی یہ تحریر کافی کے ایک معمولی سے ذائقے کو، معاشرتی زندگی کے ایک اہم جُز کے طور پر پیش کرتی ہے، جس میں طنز اور مزاح کا ایک حسین امتزاج موجود ہے۔ مصنف نے کافی کے بہانے انسانی فطرت اور سماجی تبدیلیوں کی بہترین عکاسی کی ہے۔

عبارت نمبر 8

سنا ہے کہ چائے کے بڑے خوب صورت باغ ہوتے ہیں۔ یہ بات یوں بھی سچ معلوم ہوتی ہے کہ چائے اگر کھیتوں میں پیدا ہوتی تو ایشیائی ممالک میں اتنی افراط سے نہیں ملتی بلکہ غلّہ کی طرح غیر ممالک سے درآمد کی جاتی۔ میری معلوماتِ عامہ محدود ہیں مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ کافی بھی زمین ہی سے اگتی ہوگی کیوں کہ اس کا شمار ان نعمتوں میں نہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر آسمان سے براہِ راست نازل کرتا ہے۔ تاہم میری چشمِ تخیل کو کسی طور یہ باور نہیں آتا کہ کافی باغوں کی پیداوار ہو سکتی ہے اور اگر کسی ملک کے باغوں میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے تو اللہ جانے وہاں کے جنگلوں میں کیا اُگتا ہوگا؟ ایسے اربابِ ذوق کی کمی نہیں جنھیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔ مجھ سے پوچھیے تو مجھے اپنا ملک اس لیے اور بھی عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے ذائقے پر ان کا سوال ہمیشہ لا حاصل بحث اور تلخ کلامی پر ختم ہوتا ہے۔ شائقین اسے نفیس ذوق سمجھتے ہیں، جب کہ مصنف اسے ناگوار قرار دیتے ہیں۔ بحث کے دوران میں وہ کافی کے عادی افراد کے منطقی تضادات اور ذاتیات پر اتر آنے کے رویے پر تنقید کرتے ہیں۔ ان کے مطابق کافی پر رائے لینا عاقبت نا اندیشی ہے، کیوں کہ شائقین اسے ذاتی توہین سمجھ کر بلاوجہ مشتعل ہو جاتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کی تلخی اور اس سے وابستہ تکلفات اُن پر گراں گزرتے ہیں۔ وہ کافی کے دیوانوں پر طنز کرتے ہوئے اسے ایک میٹھے زہر سے تعبیر کرتے ہیں۔ کافی بنانے کے عجیب طریقوں پر تبصرہ کرتے ہوئے، وہ اسے ایک عذاب قرار دیتے ہیں جو کافی پینے والے ہی جھیل سکتے ہیں۔ آخر میں وہ واضح کرتے ہیں کہ اُن کی یہ بے زاری کافی کے تلخ تجربات کا نتیجہ ہے۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی، ذہانت اور نفاست ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کی تحریر میں مزاح کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے جملے نہایت پختہ، شوخ اور تہہ دار ہوتے ہیں جو قاری کو مسکرانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

مصنف کہتا ہے کہ کافی ایک مشروب ہے جس کی دریافت اور ایجاد کے بارے میں یقینی معلومات موجود نہیں ہیں۔ یونانی طب میں کافی کا ذکر نہیں ملتا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافی کا علم یونان میں نہیں تھا۔ قصبوں اور شہروں میں کافی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت میں عطائیوں کے نسخوں کا کردار اہم ہے، جنھوں نے کافی کو صحت کے لیے مفید قرار دیا اور ''اللہ شافی، اللہ کافی'' کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ کافی نے صرف جسمانی فوائد ہی نہیں بلکہ سماجی تعلقات، معاشرتی رواج اور اقتصادی سرگرمیوں میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس طرح کافی نہ صرف ایک مشروب بلکہ انسانی زندگی کا ایک اہم ثقافتی اور معاشرتی عنصر بن گئی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف نے کافی اور چائے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سب سے پہلے وہ چائے کے باغات کی خوب صورتی پر بات کرتے ہوئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر چائے عام کھیتوں میں اگتی تو یہ اتنی زیادہ مقدار میں دستیاب نہ ہوتی بلکہ غلے کی طرح باہر کے ملکوں سے منگوائی جاتی۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چائے ایک خاص اور قیمتی فصل ہے جو زمین کی زرخیز اور مخصوص حالتوں میں پیدا ہوتی ہے۔ مصنف اپنی محدود معلومات کو تسلیم کرتے ہوئے قیاس کرتے ہیں کہ زمین ہی وہ ذریعہ ہے جس سے یہ فصل حاصل ہوتی ہے اور یہ آسمان سے براہِ راست انسانوں کے لیے نہیں آتی۔ یعنی زیادہ تر نعمتیں اور چیزیں جو انسان استعمال کرتا ہے، زمین اور محنت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ قرآنِ مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ انسان جن چیزوں کو بڑے شوق سے کھاتا پیتا ہے وہ زمین ہی سے اگائی جاتی ہیں نہ کہ آسمان سے نازل ہوتی ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''پس انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی چیزوں پر غور کرے۔ ہم ہی نے خوب پانی برسایا پھر ہم نے زمین کو اچھی طرح پھاڑا پھر ہم نے اس میں اناج (اور نباتات) اگائے۔'' (سورۃ عبس: 24 تا 27)

مصنف پھر کافی کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور قیاس کرتے ہیں کہ کافی بھی زمین سے پیدا ہوتی ہوگی۔ یہ اللہ کی ان نعمتوں میں سے نہیں جو براہِ راست خاص بندوں کے لیے نازل کی جاتی ہیں بلکہ یہ بھی زمین کی پیداوار ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں حاصل ہونے والی چیزیں زمین اور محنت سے وابستہ ہیں، کوئی بھی چیز محنت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ مصنف کافی کے باغات کے بارے میں سوچتے ہیں اور حیرت ظاہر کرتے ہیں کہ اگر واقعی کافی باغات میں اگتی ہے تو وہاں کے جنگلات میں اور کیا کچھ پیدا ہوتا ہوگا۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وہ کافی کی پیداوار اور اس کے ماحولیاتی پہلوؤں میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ وہ

سوچتے ہیں کہ چوں کہ کافی کی پیداوار محدود ہے اور یہ مخصوص ممالک میں ہی دستیاب ہے، اس لیے یہ لوگوں کی دل چسپی اور پسند کا سبب بنتی ہے۔ یہ انسانی نفسیات ہے کہ انسان وہ چیزیں زیادہ پسند کرتا ہے جو منفرد اور نایاب ہوں۔

اس کے بعد مصنف انسانی رویوں اور ذوق کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ کافی کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ یہ ان کے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔ غیر ملکی چیزوں کی نایابی اور دور دراز ممالک سے درآمد کی وجہ سے لوگ ان کی قدر کرتے ہیں۔ یہ انسانی نفسیات ہے کہ وہ چیزیں جو آسانی سے دستیاب نہ ہوں یا منفرد ہوں، ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور لوگ ان میں زیادہ دل چسپی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی پسند صرف ذائقے یا معیار کی بنیاد پر نہیں بلکہ کبھی کبھار نایابی اور جدت کی وجہ سے بھی بنتی ہے۔ کم یاب اور نایاب چیزوں کی قدر و اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ ایسی چیزوں کو محبت میں انسان اپنا معیارِ زندگی بھی بلند کر لیتا ہے۔ ایک فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

؎ کیمیا گر گشتہ ام در عشق تو زاں کہ حسنِ روی تو نایاب بود (حافظ شیرازی)

ترجمہ: ''میں تیری محبت میں کیمیا گر بن گیا ہوں کیوں کہ تیرا حسن تو نایاب تھا۔''

مصنف ذاتی رائے بھی بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ مشروبات کے ذائقے پرکھنے والے نہیں ہیں بلکہ وہ کسی مشروب کے اچھے یا برے ہونے کا اندازہ اس کے اثرات سے لگاتے ہیں جو اسے پینے کے بعد محسوس ہوتے ہیں۔ یعنی، ان کے نزدیک کسی چیز کی قدر کا اصل معیار اس کے اثرات ہیں نہ کہ نام یا ذائقہ یہ ایک عملی اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو کسی چیز کے معیار کا فیصلہ صرف مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر کرنا چاہیے۔ ذائقہ اور شہرت ہمیشہ معیار یا اثر کی ضمانت نہیں ہیں۔

مصنف ایک سادہ، حقیقت پسند اور مشاہدہ کرنے والے انسان ہیں جو اپنی رائے دینے سے پہلے چیزوں کو غور سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ وہ خواہش یا تخیل کی بنیاد پر فیصلے نہیں کرتے بلکہ حقیقت اور تجربے کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ وہ وطن سے محبت بھی محسوس کرتے ہیں اور خوش ہیں کہ کافی ان کے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔ غیر ملکی چیز ہونے کی وجہ سے لوگ اس میں دل چسپی لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں خود کو دوسروں سے برتر اور مہذب دکھانے کے لیے مقامی اشیا کے مقابلے میں غیر ملکی چیزوں کو بلا جواب اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ رویہ لوگوں کی ذہنی پسماندگی کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمیں اپنی مصنوعات کے استعمال پر ہی فخر کرنا چاہیے۔ بقول شاعر:

؎ اپنی مٹی ہی پہ چلنے کا سلیقہ سیکھو سنگِ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے (اقبال عظیم)

اس عبارت میں انسانی نفسیات اور ذوق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگ بعض اوقات کسی چیز کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ ان کے ملک میں پیدا نہیں ہوتی اور یہی چیز اسے قیمتی اور دل چسپ بنا دیتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انسان کی دل چسپی اور شوق اکثر چیزوں کی انفرادیت اور ان کے نایاب ہونے سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ صرف ان کے ذائقے یا ظاہری حسن سے۔

عبارت نمبر 9

کافی پی پی کر سماج کو کوسنے والے ایک انٹلیکچوئل نے مجھے بتایا کہ کافی سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔ میں بھی اس رائے سے متفق ہوں۔ کوئی معقول آدمی یہ سیال پی کر اپنا منھ بند نہیں رکھ سکتا۔ ان کا یہ دعویٰ بھی غلط نہیں معلوم ہوتا کہ کافی پینے سے بدن میں پھرتی آتی ہے۔ جبھی تو لوگ دوڑ دوڑ کر کافی ہاؤس جاتے ہیں اور گھنٹوں وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔

بہت دیر تک وہ یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ کافی نہایت مفرح ہے اور دماغ کو روشن کرتی ہے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے اپنی مثال دی کہ ''ابھی کل کا واقعہ ہے۔ میں دفتر سے گھر نڈھال پہنچا۔ بیگم بڑی مزاج دان ہیں۔ فوراً کافی کا ''Tea Pot'' لا کر سامنے رکھ دیا۔''

میں ذرا چکرایا ''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں نے دودھ دان میں سے کریم نکالی'' انھوں نے جواب دیا۔
میں نے پوچھا: ''شکر دان میں سے کیا نکلا؟''
فرمایا ''شکر نکلی اور کیا ہاتھی گھوڑے نکلتے؟''
مجھے غصہ تو بہت آیا مگر کافی کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے بارے میں عوامی رائے جاننے کی کوشش ہمیشہ تلخ ثابت ہوئی۔ شائقین جواب دینے کی بجائے ان پر جرح اور ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک کافی اور کلاسیکی موسیقی پر استفسار بدمذاقی ہے، کیوں کہ لوگ اسے جذباتی مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ وہ کافی کو کوئی حقیقی خوبی نہ مانتے ہوئے اسے محض ایک بے بنیاد عادت، سماجی دکھاوا اور بے کار شے قرار دیتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ کافی سازی ایک فنِ کیمیا گری ہے۔ وہ طنزیہ انداز میں کافی کے تلخ ذائقے، شکر کے تناسب اور اس کے اثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے ایک عذاب قرار دیتے ہیں۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ کافی سے ان کی بے زاری چائے سے لگاؤ نہیں، بلکہ کافی کے تلخ تجربات کا نتیجہ ہے۔ ان کی نظر میں کافی کے عادی افراد وہ ہیں جو اس تلخی کو ہنسی خوشی جھیلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی، ذہانت اور نفاست ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کی تحریر میں مزاح کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے جملے نہایت پختہ، شوخ اور تہہ دار ہوتے ہیں جو قاری کو مسکرانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

مصنف کہتا ہے کہ شام کے وقت لوگ اپنی روزمرہ کی مصروفیات سے فارغ ہو کر کافی ہاؤس کی طرف آتے ہیں تا کہ علمی، فلسفیانہ اور سماجی موضوعات پر گفت گو کریں اور خیالات کا تبادلہ کریں۔ ہر میز پر بیٹھے افراد اپنی دل چسپی اور مزاج کے مطابق بحث میں شامل ہوتے ہیں۔ بعض لوگ سنجیدہ اور فلسفیانہ انداز میں مباحثہ کرتے ہیں، جب کہ کچھ روزمرہ یا عوامی مسائل پر بات کرتے ہیں۔

شور و غل کے باوجود لوگ ایک دوسرے کی بات سننے کی کوشش کرتے ہیں اور بار بار پوچھتے ہیں کہ کیا کہا گیا۔ کافی پینے سے ماحول میں خوش گوار تاثر اور سکون پیدا ہوتا ہے اور لوگ بات چیت کے دوران میں اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بہتر بنانے اور نئے نظریات سیکھنے کا موقع حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات معمولی ناراضی اور خاموشی بھی ماحول کا حصہ ہوتی ہے، جو لوگوں کو اپنے جذبات پر غور کرنے اور صبر و تحمل سیکھنے کا موقع دیتی ہے۔ یہ شام ایک اجتماعی اور فکری تجربہ ہے، جو سماجی تعلقات کو مضبوط کرتی ہے اور لوگوں کو ایک دوسرے کے خیالات سے متاثر ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ کافی ہاؤس کی یہ فضا نہ صرف علمی اور فکری ترقی میں مددگار ہے بلکہ ذہنی سکون اور فکری آزادی بھی دیتی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف نہایت دل چسپ اور ہلکے پھلکے طنزیہ انداز میں اُن لوگوں کے رویوں پر بات کرتا ہے جو کافی پینے کے دل دادہ ہیں اور خود کو عقل و فہم میں دوسروں سے برتر سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ اکثر خود کو ''انٹلیکچوئل'' یعنی دانش ور ظاہر کرتے ہیں۔ وہ گھنٹوں کافی کے کپ ہاتھ میں لیے معاشرتی موضوعات پر گفت گو کرتے ہیں، دوسروں پر تنقید کرتے ہیں اور اپنے خیالات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ مصنف انھی لوگوں کی عادتوں پر ہلکے پھلکے انداز میں طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو کافی پیتے پیتے معاشرے کو کوسنے میں مصروف رہتا ہے، اُس نے اُسے بتایا کہ کافی پینے سے دل کھل جاتا ہے، جیسے کنول کا پھول کھلتا ہے، اور انسان خوش مزاج اور چہکنے والا ہو جاتا ہے۔ سرمستی کی اس کیفیت میں وہ زبانِ حال سے پکارتا ہے:

؎ گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے (مرزا غالبؔ)

مصنف اس بات سے بظاہر اتفاق کرتا ہے کہ واقعی کافی پینے سے انسان کے دل و دماغ میں ایک ہلکی سی چستی اور خوشی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی سمجھ دار آدمی ایسا نہیں جو کافی پینے کے بعد خاموش بیٹھ سکے۔ گویا کافی ایک ایسا مشروب ہے جو انسان کے اندر بات کرنے، سوچنے اور بولنے کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ کافی انسان کو بے چین نہیں بلکہ زندہ دل بنا دیتی ہے۔ اس کی تاثیر کچھ ایسی ہے کہ انسان کے چہرے پر رونق آجاتی ہے، طبیعت میں بشاشت پیدا ہوتی ہے اور وہ زیادہ متحرک محسوس کرتا ہے۔

مصنف کا یہ کہنا کہ کوئی معقول آدمی یہ سیال پی کر اپنا منھ بند نہیں رکھ سکتا ایک طرح کی مزاحیہ مگر حقیقت پسندانہ بات ہے۔ اس جملے میں مصنف نے ان لوگوں کی عادت پر ہلکا سا طنز کیا ہے جو کافی پینے کے بعد بحث و مباحثے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ وہ باتوں کے ایسے دریا بہاتے ہیں کہ خاموشی کا تصور ہی نہیں رہتا۔ ان کے نزدیک کافی پینا صرف ایک مشروب نہیں بلکہ ایک فکری سرگرمی کی علامت ہے۔ کافی صرف کافی ہاؤس میں ایک سماجی رابطے کی سرگرمی کا ذریعہ ہی نہیں، یہ سرد راتوں کی تنہائی میں محبوب کی یادوں سے دل بہلانے کے کام بھی آتی ہے۔ بقول شاعر:

؎ اداس راتوں میں تیز کافی کی تلخیوں میں وہ کچھ زیادہ ہی یاد آتا ہے سردیوں میں (وصی شاہ)

مصنف مزید کہتا ہے کہ کافی پینے سے بدن میں چستی آتی ہے۔ وہ اس بات کو جھٹلانے کے بجائے تسلیم کرتا ہے، کیوں کہ حقیقتاً کافی میں کیفین نامی کیمیائی مادہ ہوتا ہے جو جسم اور دماغ کو متحرک کرتا ہے۔ انسان تھکن، کاہلی اور بیزاری سے باہر آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ذوق و شوق سے کافی ہاؤس جاتے ہیں اور وہاں گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، کبھی دوستوں کے ساتھ تبصرے کرتے ہیں، کبھی سیاست، ادب یا معاشرت پر گفت گو کرتے ہیں۔ یوں کافی ہاؤس صرف کافی پینے کی جگہ نہیں بلکہ سماجی میل جول کا مرکز بن چکا ہے۔

مصنف کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کافی پینے والوں کے رویے کا طنز کے ساتھ ساتھ دل چسپی سے مُشاہدہ کرتا ہے۔ وہ انھیں محض مذاق کا نشانہ نہیں بناتا بلکہ ان کی عادتوں کو ایک ثقافتی مظہر کے طور پر پیش کرتا ہے۔ کافی ہاؤس میں بیٹھ کر باتیں کرنے کی عادت دراصل انسان کی اس فطری ضرورت کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنے خیالات دوسروں کے ساتھ بانٹنا چاہتا ہے۔ زندگی کی الجھنوں، تنہائی اور روزمرہ کے دباؤ سے نکلنے کے لیے وہ ایک ایسی جگہ تلاش کرتا ہے جہاں اسے ذہنی سکون اور تفریح ملے۔ کافی ہاؤس اسی مقصد کے لیے ایک مثالی جگہ بن گئی ہے۔

عبارت کے اختتام پر مصنف نے مزاحیہ انداز میں اپنے ایک دوست کا واقعہ بیان کیا ہے جو کافی کے بہت شوقین ہیں اور اسے ایک مفرح یعنی فرحت بخش مشروب سمجھتے ہیں۔ وہ مصنف کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کافی انسان کے دماغ کو تیز کرتی ہے اور تھکن دور کر دیتی ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ ایک واقعہ سناتے ہیں کہ ایک دن وہ دفتر سے بہت تھکے ہوئے گھر پہنچے۔ ان کی بیوی، جو کچھ تیز مزاج تھیں، فوراً ان کے سامنے کافی کا کپ رکھ دیتی ہیں۔ دوست کہتے ہیں کہ وہ ذرا چونکے کہ بیوی کا یہ انداز کچھ نیا تھا۔ مصنف تجسس سے پوچھتے ہیں کہ پھر کیا ہوا؟ دوست جواب دیتے ہیں کہ انھوں نے دودھ دان سے کریم نکالی۔ مصنف مزید مزاحیہ انداز میں پوچھتے ہیں کہ شکر دان سے کیا نکلا؟ تو وہ طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''شکر نکلی، اور کیا ہاتھی گھوڑے نکلتے؟''

؎ کسی کے آنے سے ساقی کے ایسے ہوش اڑے شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشے میں (میر ناظر حسین ناظم)

بیوی کے تیز لہجے اور باتوں سے دوست کو غصہ تو آیا، مگر انھوں نے غصہ پی لیا اور صرف کافی کا گھونٹ لے کر خاموش رہ گئے۔ یہاں مصنف نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کبھی کبھی ایک کپ کافی جیسی معمولی چیز بھی انسان کے مزاج کو خوش گوار بنا سکتی ہے۔ تھکن اور غصے کے عالم میں کافی انسان کو سکون اور تازگی کا احساس دیتی ہے۔ اس مزاحیہ گفت گو کے ذریعے مصنف نے انسانی نفسیات کو بڑے ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا ہے کہ زندگی کی معمولی خوشیاں اور ذائقے انسان کے رویوں کو بدل سکتے ہیں۔ آخر میں یہ احساس ہوتا ہے کہ کافی صرف ایک مشروب نہیں بلکہ موڈ بہتر کرنے کا ذریعہ ہے جو تھکن اور چڑچڑاپن کم کر دیتی ہے۔

عبارت نمبر 10

عمدہ کافی بنانا بھی کیمیا گری سے کم نہیں۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دونوں کے متعلق ہی سننے میں آیا ہے کہ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ ہر ایک کافی ہاؤس اور خاندان کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو سینہ بہ سینہ، حلق بہ حلق منتقل ہوتا رہتا ہے۔ مشرقی افریقہ کے اس انگریز افسر کا نسخہ تو سبھی کو معلوم ہے جس کی مزے دار کافی کی سارے ضلع میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے ایک نہایت پُر تکلف دعوت کی جس میں اس کے حبشی خانساماں نے بہت ہی خوش ذائقہ کافی بنائی۔ انگریز نے بہ نظرِ حوصلہ افزائی اس کو معزز مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کافی بنانے کی ترکیب پوچھی۔

حبشی نے جواب دیا: ''بہت ہی سہل طریقہ ہے۔ میں بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہوں۔ پھر اس میں کافی ملا کر دم کرتا ہوں۔''

''لیکن اسے حل کیسے کرتے ہو؟ بہت مہین چھنی ہوتی ہے۔''

''حضور کے موزے میں چھانتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی موزے استعمال کرتے ہو؟'' آقا نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔

خانساماں سہم گیا: ''نہیں سرکار! میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا۔''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے بارے میں رائے پوچھنے پر انھیں ہمیشہ بحث اور ذاتی حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کافی کے شائقین کے غیر منطقی رویے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس موضوع پر استفسار حماقت ہے۔ مصنف کے نزدیک کافی میں کوئی حقیقی خوبی نہیں بلکہ یہ ایک غیر ضروری شے ہے۔ وہ اپنی بیزاری کو حب الوطنی سے جوڑتے ہوئے فخر سے کہتے ہیں کہ انھیں اپنا ملک اس لیے عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ کافی بنانا ایک فن ہے، مگر وہ اس کی شدید تلخی پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ مزاحیہ انداز میں اسے عذاب قرار دیتے ہیں جسے برداشت کرنے والے جنت کے حق دار ہیں۔ امریکی کلچر پر طنز کے بعد، وہ واضح کرتے ہیں کہ ان کی بے زاری کا سبب چائے کی محبت نہیں، بلکہ کافی کے تلخ تجربات ہیں۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی، ذہانت اور نفاست ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کی تحریر میں مزاح کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے جملے نہایت پختہ، شوخ اور تہہ دار ہوتے ہیں جو قاری کو مسکرانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

مصنف کا دوست بتاتا ہے کہ کافی پینے سے دل خوش ہو جاتا ہے اور انسان خوش مزاج اور باتونی بن جاتا ہے۔ کافی نہ صرف جسمانی توانائی فراہم کرتی ہے بلکہ دماغ کو بھی متحرک اور ہوشیار رکھتی ہے، جس سے تھکن اور سستی دور ہو جاتی ہے۔ ایک روزمرہ واقعے کے ذریعے مصنف کا دوست بتاتا ہے کہ دفتر سے تھکے ہوئے گھر پہنچنے پر کافی نے ماحول کو خوش گوار بنا دیا، بیوی کی ناراضی کے باوجود سکون اور خوشی فراہم کی اور اس سے ذہنی تازگی پیدا ہوئی۔ کافی انسان کو چست اور پر جوش بناتی ہے، اس کے اثرات فوری محسوس ہوتے ہیں اور یہ زندگی کے عام لمحات کو خوش گوار بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ کافی سماجی تعلقات کو مضبوط کرتی ہے، لوگ کافی ہاؤس جا کر ملاقاتیں کرتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں اور دوستانہ ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کافی صرف ایک مشروب نہیں بلکہ خوشی، توانائی اور سکون پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، جو روزمرہ زندگی کے معمولات اور سماجی تعلقات کو بہتر بناتا ہے اور انسان کے موڈ کو خوش گوار اور مثبت بنائے رکھتا ہے۔ کافی کی اسی خوبی کی وجہ سے محفل میں شائقین اسے دیکھتے ہی پکار اٹھتے ہیں:

؎ تم حسن کی خود اک دنیا ہو شاید یہ تمھیں معلوم نہیں محفل میں تمھارے آنے سے ہر چیز پہ نور آجاتا ہے (ساحر لدھیانوی)

؎ مجھ تک اس محفل میں پھر جام شراب آنے کو ہے عمرِ رفتہ پلٹی آتی ہے، شباب آنے کو ہے (فانی بدایونی)

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتا ہے کہ عمدہ کافی بنانا کسی کیمیا گری سے کم نہیں۔ یعنی یہ کوئی عام کام نہیں بلکہ ایک ایسا فن ہے جس میں صبر، محنت اور درست طریقہ اختیار کرنا بہت ضروری ہے۔ کافی کا ذائقہ اکثر ایک معمولی سی کمی یا زیادتی سے مکمل طور پر بدل سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر کافی ہاؤس یا ہر خاندان کا اپنا مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو برسوں محفوظ رہتا ہے اور نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ یہ نسخے عام طور پر راز کی طرح محفوظ کیے جاتے ہیں اور اکثر صرف اہلِ خانہ یا خاص لوگ ہی انھیں جان پاتے ہیں۔

مشرقی افریقہ کا ایک انگریز افسر، جو اپنی کافی کے نسخے کی وجہ سے پورے ضلع میں مشہور تھا۔ اس کی کافی کے ذائقے کی تعریف سن کر لوگ اس کے پاس آتے اور شوق سے کافی پیتے۔ کافی بنانے کا عمل نہ صرف ایک روزمرہ کام ہے بلکہ یہ سماجی حیثیت، مہمان نوازی اور لوگوں کے درمیان اثر و رسوخ پیدا کرنے کا بھی ذریعہ ہے۔ ایک دن اس افسر نے ایک نہایت پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا، جس میں اس کے حبشی خانساماں نے مہمانوں کے لیے کافی تیار کی۔ کافی کے ذائقے اور خوش بو نے سب کو بہت متاثر کیا۔

اسلام میں مہمان نوازی کی بہت اہمیت ہے۔ مہمان کی عزت اور خاطر تواضع پر بہت زور دیا گیا ہے: آنحضور ﷺ نے فرمایا:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ (صحیح بخاری)

ترجمہ: ”جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کو عزت دے۔“

مہمانوں کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کے آثار نمایاں تھے۔ انگریز افسر نے خانساماں کو مہمانوں کے سامنے بلا کر اس کی بہت تعریف اور حوصلہ افزائی کی اور اس سے کافی بنانے کی ترکیب پوچھی۔ خانساماں نے سادگی سے بتایا کہ کافی بنانے کا طریقہ بالکل آسان ہے۔ وہ بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہے اور اس میں کافی ڈال کر اسے دم دیتا ہے۔ لیکن کافی کی اصلی خوش بو اور ذائقہ چھاننے کے عمل میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

خانساماں نے بتایا کہ کافی کو چھاننے کے لیے ایک مہین چھلنی استعمال کی جاتی ہے، جو کافی کے ذائقے کو خوش گوار بناتی ہے۔ چھاننے کے عمل سے کافی میں موجود تلخی دور ہو جاتی ہے اور اس کا ذائقہ متوازن اور خوش بودار ہو جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ کافی چھاننے کے لیے وہ اپنے افسر کے موزے استعمال کرتا ہے۔ جب افسر نے غضب ناک ہو کر پوچھا کہ چھاننے کے لیے میرے قیمتی موزے استعمال کیے جاتے ہیں، تو خانساماں نے فوری جواب دیا کہ وہ افسر کے قیمتی ریشمی موزے ہرگز استعمال نہیں کرتا بلکہ وہ بغیر دھلے ہوئے موزے استعمال کرتا ہے تاکہ کافی کا ذائقہ بہتر رہے اور قیمتی چیزیں محفوظ رہیں۔

عمدہ کافی بنانے کے لیے محنت، صبر اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پانی کی مقدار، دودھ کا معیار اور چھاننے کا صحیح طریقہ کافی کے ذائقے کو بہتر یا خراب کر سکتا ہے۔ اسی طرح، روایت اور تجربہ بھی کافی کے ذائقے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہر خاندان یا کافی ہاؤس کے اپنے مخصوص نسخے ہوتے ہیں جو برسوں کے تجربے سے تیار کیے جاتے ہیں اور انھیں بڑے شوق کے ساتھ محفوظ کیا جاتا ہے۔

؎ نسخے میں طبیبوں نے لکھا اور ہی کچھ ہے بیمارِ محبت کی دوا اور ہی کچھ ہے (داغ دہلوی)

مصنف نے عبارت میں کافی کی تیاری کے فن، مہارت اور روایت کو اجاگر کیا ہے۔ وہ صرف کافی بنانے کے طریقے کو بیان نہیں کرتا بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ کس طرح صبر، محنت اور درست عمل سے بہترین نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ عمدہ کافی محض ایک مشروب نہیں بلکہ یہ فن، محنت اور ثقافتی روایت کا مجموعہ ہے۔ اس میں ذائقہ، خوش بو اور پیش کش سب اہم کردار ادا کرتے ہیں اور یہی چیز کافی کو عام مشروب سے ممتاز کرتی ہے۔ دراصل زندگی کے کسی بھی شعبے میں عمدگی اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے تجربہ، محنت اور صبر ضروری ہے۔ ہر تفصیل پر توجہ دینا، چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دینا اور اصولوں پر قائم رہنا کامیابی کی کلید ہے۔ چاہے وہ کافی کی تیاری ہو یا کسی اور کام میں مہارت، ہر عمل میں بہتری اسی وقت ہوتی ہے جب ہر جزو کو صحیح طریقے سے اختیار کیا جائے۔

مختصر یہ کہ مصنف نے کافی بنانے کے فن، اس کے نسخوں کی حفاظت، محنت، مہارت اور انسانی اقدار کو سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کسی بھی کام میں مہارت اور ذائقہ حاصل کرنے کے لیے تجربہ، صبر، محنت اور اصولوں پر عمل کرنا ضروری ہے اور یہی چیز کسی کام کو عام سے خاص بناتی ہے۔ بقول غالبؔ:

؎ دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہرے ہونے تک

عبارت نمبر 11

سچ عرض کرتا ہوں کہ میں کافی کی تُندی اور تلخی سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بچپن ہی سے یونانی دواؤں کا عادی رہا ہوں اور قوتِ برداشت اتنی بڑھ گئی ہے کہ کڑوی سے کڑوی

ع گولیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

لیکن کڑواہٹ اور مٹھاس کی آمیزش سے جو معتدل قوام بنتا ہے وہ میری برداشت سے باہر ہے۔ میری انتہا پسند طبیعت اس بیٹھے زہر کی تاب نہیں لاسکتی۔ لیکن دِقّت یہ آن پڑتی ہے کہ میں میزبان کے اصرار کو عداوت اور وہ میرے انکار کو تکلّف پر محمول کرتے ہیں۔ لہٰذا جب وہ میرے کپ میں شکر ڈالتے وقت اخلاقاً پوچھتے ہیں: ''ایک چمچہ یا دو؟''

تو مجبوراً یہی گزارش کرتا ہوں کہ ''میرے لیے شکردان میں کافی کے دو چمچے ڈال دیجیے۔''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے بارے میں رائے جاننا فضول ہے، کیوں کہ شائقین دلیل کی بجائے بحث اور ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ وہ کافی کے ذائقے اور خوش بو کو ناپسند کرتے ہوئے اس کے تمام فوائد کو مسترد کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کافی کے بارے میں استفسار کرنا کسی کی نجی زندگی میں دخل اندازی ہے۔ مصنف طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ کافی انسان کو غیر ضروری طور پر چہکنے پر اکساتی ہے۔ انھیں فخر ہے کہ ان کے ملک میں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ وہ اپنی انتہا پسند طبیعت کے باعث کافی کی تلخی میں مٹھاس کے ملاپ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ تکلفات کے بجائے فوری ذائقے پر یقین رکھتے ہیں۔ کافی کو وہ ایک تلخ عذاب قرار دیتے ہوئے مزاحیہ اور طنزیہ تجاویز پیش کرتے ہیں۔ آخر میں وہ یہ وضاحت کرتے ہیں کہ ان کی کافی سے بے زاری چائے کی محبت میں نہیں بلکہ کافی کے تلخ تجربات کا نتیجہ ہے۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی، ذہانت اور نفاست ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کی تحریر میں مزاح کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے جملے نہایت پختہ، شوخ اور تہہ دار ہوتے ہیں جو قاری کو مسکرانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

مصنف بتاتا ہے کہ عمدہ کافی بنانا کوئی عام کام نہیں بلکہ ایک فن ہے۔ ہر کافی ہاؤس یا خاندان کا اپنا مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ ذائقے کی پہچان بن جاتا ہے۔ مشرقی افریقہ کے ایک انگریز افسر کے حبشی خانساماں کی مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عمدہ کافی صرف اجزا کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ درست طریقہ، پانی اور دودھ کی مناسب مقدار اور چھاننے کے عمل سے تیار ہوتی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کافی کے ذائقے کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسے کافی کی تلخی یا تندی سے بالکل خوف یا گھبراہٹ نہیں ہوتی، کیوں کہ اس نے بچپن ہی سے سخت اور تلخ ذائقوں کا تجربہ کیا ہے اور اس میں قوتِ برداشت بھی بہت ہے۔ وہ اپنی قوتِ برداشت کو واضح کرنے کے لیے یونانی دواؤں کا ذکر کرتا ہے۔ یونانی دوائیں عام طور پر تلخ اور سخت ذائقے کی حامل ہوتی ہیں اور اس کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ دکھایا جا سکے کہ بچپن سے ہی اس کی ذائقے کی قوت بہت زیادہ ہے۔

وہ بتاتا ہے کہ اس کی برداشت اتنی زیادہ ہے کہ وہ تلخ گولیاں کھا کر بھی بے مزا یا پریشان نہیں ہوتا۔ وہ سخت ذائقوں کو سہنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی ذاتی قوت اور مزاج بہت پختہ ہے۔

؎ زخم کھاتے ہیں اور مسکراتے ہیں ہم حوصلہ اپنا خود آزماتے ہیں ہم (اے۔جی جوش)

وہ تلخی اور مٹھاس کے امتزاج کے بارے میں بات کرتا ہے۔ یعنی جب کافی میں تلخی اور مٹھاس دونوں شامل ہوں تو اسے اس امتزاج کا مزہ برداشت کرنا مشکل لگتا ہے۔ یہاں وہ اپنی انفرادیت اور ذاتی پسند کو واضح کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یا تو شدید تلخ ذائقے کو پسند کرتا ہے یا مکمل مٹھاس کو معتدل ذائقہ، جو تلخی اور مٹھاس کا مرکب ہوتا ہے، اس کے مزاج کے لیے مناسب نہیں ہے۔ ہر انسان کی ذاتی پسند اور مزاج مختلف ہوتا ہے۔ کچھ لوگ سخت ذائقوں کو برداشت کر سکتے ہیں، جب کہ کچھ لوگ نرم یا معتدل ذائقوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ عبارت کے اس حصے میں ذائقے کی شدت اور برداشت کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے اپنی انتہا پسند طبیعت کا ذکر کیا ہے، جو یا تو شدید تلخی یا شدید ذائقے کو پسند کرتی ہے، لیکن معتدل امتزاج کے ذائقے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتی۔

؎ پی جا ایام کی تلخی کو بھی ہنس کر ناصرؔ غم کو سہنے میں بھی قدرت نے مزا رکھا ہے (حکیم ناصرؔ)

مصنف بتاتا ہے کہ کبھی کبھار اسے دقت پیش آتی ہے کیوں کہ میزبان کے اصرار کو وہ عداوت یا سخت مزاجی سمجھ لیتا ہے اور اس کے انکار کو لوگ تکلف یا رسمی ادب کے طور پر لیتے ہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ مصنف کی ذاتی پسند اور معاشرتی توقعات کے درمیان کشمکش موجود ہے۔ وہ اپنی پسند کا اظہار کرنا چاہتا ہے، لیکن سماجی رویے اور مہمان نوازی کے تقاضے بھی اس کے سامنے ہیں۔ یہ کشمکش ایک عام انسانی تجربے کی عکاسی کرتی ہے۔ زندگی میں اکثر ہمیں اپنی ذاتی پسند اور سماجی تعلقات کے درمیان توازن قائم رکھنا پڑتا ہے۔ ہر شخص کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں اور کبھی کبھی معاشرتی توقعات ہمیں اپنی ذاتی پسند کے اظہار میں محتاط کر دیتی ہیں۔ اور ہمیں معاشرتی جبر کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔

؎ زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں (فانی بدایونی)

مصنف ایک مخصوص منظر بیان کرتا ہے۔ جب میزبان کافی میں شکر ڈالنے کے وقت پوچھتا ہے، ''ایک چمچہ یا دو؟'' تو اس سوال میں میزبان کی مہمان نوازی اور احترام کا جذبہ موجود ہے۔ یہ سوال مہمان کی راحت اور پسند کو اہمیت دینے کا انداز ہے۔ مہمان کی حیثیت سے، وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ذائقے کے مطابق جواب دے، تاکہ دونوں طرف خوش گوار تعلق قائم رہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ شکردان میں کافی کے دو چمچے ڈالنے کی گزارش کرتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اپنی ذاتی پسند کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اس عبارت کے ہر جز میں انسانی مزاج، ذائقہ، برداشت اور معاشرتی تعلقات کی نزاکت کی عکاسی موجود ہے۔ تلخی کی برداشت، معتدل ذائقہ کی ناپسندیدگی، میزبان کی مہمان نوازی اور شکر ڈالنے کا منظر سب مل کر انسانی نفسیات اور معاشرتی زندگی کی ایک مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف ذائقے کی بات ہے بلکہ انسانی رویے اور معاشرتی توازن کی بھی کہانی ہے۔

؎ زندگی بھر کرب کی سولی پہ ہم لٹکے رہیں دیکھنے والوں کو لیکن دل لگی محسوس ہو (مرتضیٰ برلاس)

مختصر یہ کہ مصنف نہ صرف کافی کے ذائقے کے بارے میں بتاتا ہے بلکہ انسانی مزاج، ذاتی پسند، برداشت اور سماجی رویوں کے درمیان تعلق کی مکمل تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ تلخی، مٹھاس، مہمان نوازی، شکر ڈالنے کا منظر اور ذاتی پسند کے اظہار کے طریقے سب مل کر انسانی نفسیات اور معاشرتی تعلقات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس طرح، مصنف زندگی کے ان پہلوؤں کے بارے میں بھی بتاتا ہے جو روزمرہ کی زندگی میں عام نظر نہیں آتے، لیکن اہمیت کے حامل ہیں۔

عبارت نمبر 12

صاف ہی کیوں نہ کہ دوں کہ جہاں تک اشیائے خورونوش کا تعلق ہے، میں تہذیب حواس کا قائل نہیں۔ میں یہ فوری فیصلہ ذہن کے بجائے زبان پر چھوڑنا پسند کرتا ہوں۔ پہلی نظر میں جو محبت ہو جاتی ہے اس میں بالعموم نیت کا فتور کارفرما ہوتا ہے لیکن

کھانے پینے کے معاملے میں میرا یہ نظریہ ہے کہ پہلا ہی لقمہ یا گھونٹ فیصلہ کُن ہوتا ہے۔ بدذائقہ کھانے کی عادت کو ذوق میں تبدیل کرنے کے لیے بڑا پتا مارنا پڑتا ہے مگر میں اس سلسلے میں برسوں تلخی کام و دہن گوارا کرنے کا حامی نہیں، تاوقتیکہ اس میں بیوی کا اصرار یا گرہستی مجبوریاں شامل نہ ہوں۔ بنابریں میں ہر کافی پینے والے کو جنتی سمجھتا ہوں، میرا عقیدہ ہے کہ جو لوگ عمر بھر ہنسی خوشی یہ عذاب جھیلتے رہے، ان پر دوزخ اور جحیم حرام ہیں۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے بارے میں رائے لینا حماقت ہے کیوں کہ شائقین دلیل کی بجائے ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ وہ کافی کی مہک اور ذائقے کے دعوؤں کو محض کج بحثی قرار دیتے ہیں اور کافی ہاؤس کو غیر معقول گفت گو کا مرکز سمجھتے ہیں۔ مصنف طنزیہ انداز میں کافی کی افادیت کو مسترد کرتے ہوئے اسے طبی اور تہذیبی اعتبار سے غیر ضروری قرار دیتے ہیں کیوں کہ کافی کی کڑواہٹ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ کافی اور امریکی کلچر کا باہمی تعلق ایک لاحاصل بحث ہے۔ وہ کافی کی ہمہ گیری پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر اس کا استعمال مجرموں کی اصلاح یا مریضوں کے آخری لمحات میں تسکین کا ذریعہ بنے تو کسی کو اعتراض نہیں۔ اپنی پسند پر بات کرتے ہوئے وہ واضح کرتے ہیں کہ کافی سے ان کی بے زاری چائے سے تعصب کی بنا پر نہیں بلکہ ذاتی تلخ تجربات کا نتیجہ ہے۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی، ذہانت اور نفاست ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کی تحریر میں مزاح کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے جملے نہایت پختہ، شوخ اور تہہ دار ہوتے ہیں جو قاری کو مسکرانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف اپنی ذاتی ترجیحات اور تجربات کی بنیاد پر کھانے میں پسند اور ناپسند کے بارے میں واضح موقف پیش کرتا ہے کہ کھانے کے معاملے میں وہ ''تہذیبِ حواس'' یعنی کسی قسم کے مہذب یا خوب صورت کھانے کے آداب پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کھانے کی ظاہری خوب صورتی، ترتیب یا سماجی آداب کی پروا نہیں کرتا۔ اس کے لیے سب سے اہم چیز کھانے کا ذائقہ ہے، نہ کہ کھانے کی شکل یا اس کے پیش کرنے کا طریقہ۔ اسلام بھی ظاہری نمود و نمائش کے بجائے خلوص کو پسند کرتا ہے۔ جس طرح کھانا اپنے ذائقے کی وجہ سے اہم ہوتا ہے، نہ کہ اپنی شکل و صورت اور پیش کرنے کے طریقے سے، اسی طرح لوگوں کے دلوں کے اخلاص کی اہمیت ہوتی ہے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

''بے شک اللہ تمھاری صورتوں اور تمھارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمھارے دلوں اور تمھارے اعمال کو دیکھتا ہے۔'' (صحیح مسلم)

اور بقول شاعر:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی (علامہ اقبال)

مصنف کا یہ مشاہدہ انتہائی گہرا اور حقیقت پسندانہ ہے کہ انسانی تعلقات اور بالخصوص پہلی نظر میں ہونے والی محبت کے دعوے میں، ہم اکثر و بیشتر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی محبت کے پیچھے اکثر اخلاص کے بجائے نیت کا فتور یا کوئی خاص خود غرضی کارفرما ہوتی ہے، جس کا احساس انسان کو وقت گزرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن کھانے کے معاملے میں وہ ''پہلی نظر'' کے نہیں، بلکہ ''پہلے لقمے'' کے قائل ہیں۔

جب بھی کھانے یا پینے کی چیزوں کا انتخاب ہوتا ہے تو وہ زیادہ سوچنے یا سمجھنے کے بجائے، فوری طور پر زبان اور ذائقے پر انحصار کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے پہلا لقمہ یا پہلا گھونٹ ہی فیصلہ کرتا ہے۔ اگر کھانے کا پہلا ذائقہ برا لگا تو اسے

پسندیدہ بنانے میں بہت زیادہ محنت اور وقت درکار ہوگا۔ انسانی فطرت کے مطابق، پہلا تاثر بہت مضبوط ہوتا ہے اور بعد میں اسے تبدیل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مزید وضاحت کے لیے، وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی کھانا شروع میں برا یا ناپسندیدہ لگے تو اسے پسندیدہ بنانے کے لیے بہت صبر اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کے ذائقے اور پسند و ناپسند کا تعلق جذبات اور حسّیات سے ہے۔ پہلا تجربہ اکثر باقی تجربات سے زیادہ اثر رکھتا ہے، اور اسی وجہ سے وہ پہلے لقمے کو فیصلہ کن قرار دیتا ہے۔

؎ کیسا باورچی ہے، کیسا ہے ہنر کا یہ کمال پہلے لقمے میں ہی کھل جاتا ہے سارا یہ جلال

مصنف مزید کہتا ہے کہ اگر کوئی کھانا بدذائقہ یا تلخ ہو تو وہ اسے طویل عرصے تک کھانے کے لیے آمادہ نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کے معاملے میں اصولی اور پختہ رویہ رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کھانے کا تجربہ خوش گوار ہو اور اس میں تکلف یا ناپسندیدگی شامل نہ ہو۔ تاہم وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ بعض اوقات، خاندانی یا سماجی تعلقات کے پیشِ نظر کچھ حد تک سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ اگر بیوی کی درخواست ہو یا گھریلو ضروریات کی وجہ سے کچھ کھانا پڑے تو وہ اپنے اصول میں نرمی کرنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی پسند کو اہمیت دیتا ہے، مگر تعلقات کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے بعض اوقات لچک دکھانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہ انسانی رویے کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ زندگی میں کبھی کبھار ہمیں ذاتی ترجیحات اور سماجی توقعات کے درمیان توازن پیدا کرنا پڑتا ہے۔ یہ نظریہ کھانے کے ذائقے اور انسانی حسّیات کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ کھانا صرف جسمانی ضرورت کے لیے نہیں بلکہ خوشی اور لذت کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس لیے کھانے کا ذائقہ بہت اہم ہوتا ہے کیوں کہ یہ پہلا تاثر پیدا کرتا ہے اور یہ تاثر اکثر دیرپا ہوتا ہے۔ پہلا لقمہ یا پہلا گھونٹ ہی فیصلہ کرتا ہے کہ کھانا پسند آئے گا یا نہیں۔ اگر یہ پہلا تاثر منفی ہو تو اسے پسند کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ کہتا ہے کہ کھانے کا پہلا ہی لقمہ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ انسانی مزاج کی خاصیت ہے کہ کسی کام یا تجربے کا پہلا تاثر ہی اس کے حتمی فیصلے کی بنیاد بنتا ہے۔ فارسی مقولہ ہے:

''تا نخوری لقمۂ اول، نشناسی مزہ را''

ترجمہ: ''پہلا لقمہ کھائے بغیر آپ اس کا ذائقہ نہیں پہچان سکتے۔''

عبارت کا اختتامیہ کافی کے حوالے سے ہے جو بذاتِ خود ایک کمالِ فن ہے۔ کافی کی تلخی اور اس کے ذائقے کی نزاکت سے کون واقف نہیں؟ لیکن یوسفی صاحب اسے ایک مقدس مشقت کا درجہ دیتے ہوئے یہ اعلان کرتے ہیں کہ کافی پینے والے ہر شخص کو ''جنتی'' سمجھا جانا چاہیے۔ یہاں ان کا طنز اپنے عروج پر ہے کہ جو لوگ اس دنیا میں کافی جیسی کڑوی اور تلخ چیز کو اپنی مرضی سے ایک عادت بنا کر جھیل رہے ہیں، انہیں مزید کسی سزا کی ضرورت نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر دوزخ کی آگ اور حمیم حرام ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے کافی پی کر دنیا میں ہی اپنی دوزخ کی سزا مکمل کر لی ہے اور اب وہ اس قدر صابر اور متحمل ہو چکے ہیں کہ انہیں کسی مزید عذاب کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ ان لوگوں کی استقامت کو ایک مزاحیہ خراجِ تحسین ہے جو اپنے ذوق کو برقرار رکھنے کے لیے بڑی سے بڑی تلخی کو بھی ایک خوشگوار معمول بنا لیتے ہیں۔

؎ ہمارے لہجے میں یہ توازن بڑی صعوبت کے بعد آیا کئی مزاجوں کے دشت دیکھے، کئی رویّوں کی خاک چھانی (عزم بہزاد)

مختصر یہ کہ کھانے کے معاملے میں انسان کی انفرادی آزادی اور انتخاب کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ ہر شخص کے ذائقے اور پسند مختلف ہوتے ہیں اور اسے اپنی مرضی سے انتخاب کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ بعض لوگ کھانے کو صرف جسمانی ضرورت یا معاشرتی رسم و رواج کے مطابق دیکھتے ہیں، جب کہ بعض لوگ اسے مزے اور ذائقے کے لحاظ سے دیکھتے ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ کھانے کو ذائقے کی بنیاد پر چکھا جائے، نہ کہ محض رسم یا آداب کی بنیاد پر۔ وہ کہتا ہے کہ کھانے کے آداب یا پُرتکلف اصولوں پر زیادہ غور کرنے کے بجائے سیدھے اور سادہ انداز میں کھانے کے ذائقے کو محسوس کرنا بہتر ہے۔ اس طرح کھانے کا تجربہ خوش گوار اور ذاتی ترجیحات کے مطابق ہوتا ہے کیوں کہ یہ رویہ انسانی فطرت کے مطابق ہے۔

عبارت نمبر 13

کافی امریکا کا قومی مشروب ہے۔ میں اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ امریکی کلچر کافی کے زور سے پھیلا یا کافی کلچر کے زور سے رائج ہوئی۔ یہ بعینہٖ ایسا سوال ہے جیسے کوئی بے ادب یہ پوچھ بیٹھے کہ ''غبارِ خاطر'' چائے کی وجہ سے مقبول ہوئی یا چائے ''غبارِ خاطر'' کے باعث؟ ایک صاحب نے مجھے لاجواب کرنے کی خاطر یہ دلیل پیش کی، امریکا میں تو کافی اس قدر عام ہے کہ جیل میں بھی پلائی جاتی ہے۔ عرض کیا کہ جب خود قیدی اس پر احتجاج نہیں کرتے تو ہمیں کیا پڑی کہ وکالت کریں۔ پاکستانی جیلوں میں بھی قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جائے تو انسدادِ جرائم میں کافی مدد ملے گی۔ پھر انھوں نے بتایا کہ وہاں لاعلاج مریضوں کو بشاش رکھنے کی غرض سے کافی پلائی جاتی ہے۔ کافی کے سریع التاثیر ہونے میں کیا کلام ہے۔ میرا خیال ہے کہ دمِ نزع حلق میں پانی چوانے کے بجائے کافی کے دو چار قطرے ٹپکا دیے جائیں تو مریض کا دم آسانی سے نکل جائے۔ بخدا، مجھے تو اس تجویز پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ گناہ گاروں کی فاتحہ کافی پر دلائی جائے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے بارے میں عوامی رائے جاننے کی کوشش کا انجام ہمیشہ بحث و تکرار ہوتا ہے۔ وہ کافی کی تلخی اور سوندھی خوش بو کو مسترد کر کے اسے میٹھا زہر قرار دیتے ہیں۔ کافی کے طبی اور سماجی فوائد پر طنز کرتے ہوئے وہ اسے ایک عذاب سمجھتے ہیں۔ آخر میں مصنف کہتے ہیں کہ جو لوگ زندگی بھر کافی جیسی تلخ چیز کا عذاب جھیل لیتے ہیں، وہ یقیناً جنت کے مستحق ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے مقابلے میں چائے کی حمایت کا تاثر ایک غلط فہمی ہے۔ ان کا کافی سے بے زار ہونے کا سبب چائے کی محبت نہیں، بلکہ کافی کے تلخ تجربات ہیں۔ مصنف طنزیہ انداز میں اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کافی پینے کے بعد ہونے والی کیفیت ایسی ہے کہ اب وہ ہر مشروب کو انتہائی احتیاط سے استعمال کرتے ہیں۔

تشریح

تشریح طلب عبارت مشتاق احمد یوسفی کے مخصوص اور شگفتہ اندازِ بیان کا ایک بہترین نمونہ ہے، جس میں وہ کافی کے عادی معاشرے، خاص طور پر امریکی معاشرے پر ہلکے پھلکے انداز میں چوٹ کر رہے ہیں۔ یوسفی صاحب کا یہ انداز ہے کہ وہ بات کو اتنی سادگی سے کہتے ہیں کہ پڑھنے والا محظوظ بھی ہوتا ہے اور حقیقت کو بھی پالیتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ امریکا میں کافی کا استعمال صرف ایک مشروب کے طور پر نہیں بلکہ ایک ثقافتی ضرورت کے طور پر کیا جاتا ہے۔ وہ اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ کافی نے امریکی معاشرت کو تشکیل دیا ہے یا کافی کی مقبولیت نے اس معاشرے کے مزاج کو بدلا ہے، کیوں کہ یہ بحث لاحاصل ہے۔ وہ اس غیر ضروری بحث کو بالکل ایسے ہی قرار دیتے ہیں جیسے مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور کتاب ''غبارِ خاطر'' اور چائے کا رشتہ۔ جس طرح یہ طے کرنا مشکل ہے کہ چائے کی وجہ سے یہ کتاب مشہور و مقبول ہوئی یا اس کتاب کی وجہ سے چائے، اسی طرح کافی اور امریکی کلچر کا تعلق بھی ناقابلِ فہم ہے۔ یہ یوسفی صاحب کا مخصوص مزاح ہے جس میں وہ بات کو ایک ادبی تناظر دے کر اس کی غیر اہم نوعیت کو واضح کر دیتے ہیں۔

سوال کرتی کئی آنکھیں منتظر ہیں یہاں جواب آج بھی ہم سوچ کر نہیں آئے (آشفتہ چنگیزی)

مصنف اس دلیل کو رد کرتے ہیں کہ کافی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ امریکی جیلوں میں قیدیوں کو پلائی جاتی ہے۔ مصنف بڑے طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ اگر قیدیوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو باہر کے لوگوں کو اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہاں وہ پاکستانی معاشرے کے جیل خانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک سماجی تبصرہ بھی کر جاتے ہیں کہ اگر ہماری جیلوں میں بھی قیدیوں کے ساتھ یہی سلوک یعنی کافی پلانے کا رواج ڈال دیا جائے تو شاید جرائم کی شرح

میں کمی آ جائے۔ یہ بات دراصل ہمارے نظامِ اصلاحِ احوال اور قیدیوں کے حالات پر ایک گہرا طنزیہ تبصرہ ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کہتے ہیں:

''طعن و تشنیع سے اگر دوسروں کی اصلاح ہو جاتی تو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی''

اور بقول شاعر:

؎ عجب اندھیر ہے اس دورِ پُر آشوب میں راہی ضرورت جن کی زائد ہے وہی کم ہوتے جاتے ہیں
نظر آتی تو ہیں بڑھتی ہوئی آبادیاں لیکن تری دنیا میں یارب آدمی کم ہوتے جاتے ہیں (دوا کر راہی)

اس کے بعد مصنف کی بات کا رخ کافی کے طبی اور جذباتی اثرات کی طرف مڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کافی کے سریع التاثیر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ وہ اسے اتنا زیادہ مؤثر مانتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ صرف جاگنے یا چستی لانے کے لیے نہیں بلکہ موت کے وقت بھی کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ بڑی ظرافت کے ساتھ تجویز دیتے ہیں کہ اگر آخری وقت میں پانی پلانے کے بجائے کافی کے چند قطرے حلق میں انڈیل دیے جائیں تو مرنے والے کی روح آسانی سے نکل سکتی ہے۔ یہ جملہ کافی کی تاثیر اور اس کی مقبولیت پر ایک بڑا طنزیہ فقرہ ہے، جس میں وہ کافی کو زندگی کی ہر کیفیت کے ساتھ جوڑ رہے ہیں۔

؎ نزع کی ہچکی مریضِ ہجر کی دم ساز ہے سننے والے غور سے سن آخری آواز ہے (افقر موہانی)

عبارت کا اختتام ایک اور دل چسپ اور مزاحیہ تجویز پر ہوتا ہے کہ اگر گناہ گاروں کی فاتحہ بھی کافی پر دلائی جائے تو انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ بات کافی کی اہمیت کو اس حد تک لے جاتی ہے کہ اب اسے مذہبی رسومات کے ساتھ بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر مصنف نے اس مختصر سی تحریر میں کافی کی لت، اس کی عالمگیریت اور انسانوں پر اس کے اثرات کو مزاح کے پیرائے میں بہت خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ ان کا مقصد کافی کی برائی کرنا نہیں، بلکہ اس مشروب کے گرد بنے اس ''کافی کلچر'' کو بے نقاب کرنا ہے جو جدید دور کے انسان کی زندگی کا ایک لازمی اور بعض اوقات مضحکہ خیز حد تک اہم حصہ بن چکا ہے۔ مصنف کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو نہ تو بہت زیادہ سنجیدہ بناتے ہیں اور نہ ہی اسے بالکل سطحی رہنے دیتے ہیں، بلکہ مزاح کی چاشنی میں لپیٹ کر قاری کے سامنے ایک ایسی تصویر پیش کر دیتے ہیں جس میں ہم سب کی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو چھپا ہوتا ہے۔ ان کے یہ جملے کافی کی ضرورت اور اس کے بے جا استعمال پر ایک ایسا طنز ہیں جو پڑھنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ تو بکھیر دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی کافی کی اس عادت کے بارے میں غور و فکر کرنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

؎ جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبالؒ)

عبارت نمبر 14

آپ کے ذہن میں خدانخواستہ یہ شبہ نہ پیدا ہو گیا ہو کہ راقم السطور کافی کے مقابلے میں چائے کا طرف دار ہے تو مضمون ختم کرنے سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کافی سے اس لیے بے زار نہیں ہوں کہ مجھے چائے عزیز ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافی کا جلا چائے پھونک پھونک کر پیتا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس!
ایک وہ ہیں کہ جنھیں ''چائے'' کے ارماں ہوں گے

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کافی کے بارے میں رائے جاننے کی کوشش کا انجام ہمیشہ بحث پر ہوتا ہے۔ وہ کافی کو ایک کڑوا مشروب سمجھتے ہیں اور اس کے سوندھے پن کے دعووں کو محض قوتِ شامہ کی کوتاہی قرار دیتے ہیں۔ انسان عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہر بری چیز میں خوبی تلاش کر لیتا ہے۔ وہ کافی پینے کو ایک عذاب سمجھتے ہیں۔ آخر میں، وہ طنزیہ

انداز میں تجویز دیتے ہیں کہ اگر کافی قیدیوں یا نزع کے عالم میں مریضوں کو دی جائے تو شاید ان کے لیے راحت کا باعث بنے۔ اس طرح وہ کافی سے اپنی شدید بے زاری کا اظہار کرتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت سبق کی آخری عبارت ہے اس لیے اس کا سباق نہیں ہے۔

تشریح

مشتاق احمد یوسفی اردو ادب کے وہ ممتاز مزاح نگار ہیں جن کی تحریروں میں طنز کی کاٹ اور الفاظ کی بازیگری کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ زیرِ نظر عبارت ان کے مخصوص اور شاہکار اسلوب کی بہترین مثال ہے، جس میں وہ انتہائی سنجیدہ معلوم ہونے والی بات کو بھی اپنے مخصوص انداز میں مزاح کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کے اسے یہ خدشہ لاحق ہے کہ کہیں پڑھنے والے یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ وہ چائے کے حق میں کافی کی مخالفت کر رہے ہیں۔ یوسفی صاحب کا یہ اندازِ بیان دراصل ان کا انکسار اور اپنی بات کو واضح کرنے کی ایک کوشش ہے، جس میں وہ مزاح کا تڑکا لگا کر قاری کو اپنے ساتھ جوڑے رکھتے ہیں۔ وہ وضاحت کرتے ہیں کہ ان کی کافی سے دوری کا سبب چائے سے حد درجہ محبت نہیں ہے، بلکہ کافی پینے کا کوئی ناخوش گوار واقعہ یا اس کا تلخ تجربہ ہے۔

؎ اب سمجھ لیتے ہیں میٹھے لفظ کی کڑواہٹیں ہو گیا ہے زندگی کا تجربہ تھوڑا بہت (منظر بھوپالی)

مصنف اس بات کو وہ ایک ضرب المثل کے انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ ''کافی کا جلا چائے پھونک پھونک کر پیتا ہے۔'' یہ دراصل اس مشہور مقولے کی تحریف ہے کہ ''دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔'' یوسفی صاحب نے یہاں اپنے مضمون کی مناسبت سے دودھ کی جگہ کافی اور چھاچھ کی جگہ چائے کا ذکر کر کے طنز کے تیر چلائے ہیں۔ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ انسان جب کسی چیز سے ایک بار ٹھوکر کھا لیتا ہے یا اسے کوئی برا تجربہ ہوتا ہے تو وہ آئندہ اس سے ملتے جلتے معاملے میں حد سے زیادہ محتاط ہو جاتا ہے۔ مصنف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شاید ماضی میں کافی نوشی کے دوران میں انھیں کسی قسم کی تکلیف، بے چینی یا کوئی ایسا ناخوش گوار تجربہ ہوا ہوگا جس نے ان کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا اور اب وہ کسی بھی گرم مشروب کو پیتے ہوئے ڈرتے ہیں اور پوری احتیاط برتتے ہیں تاکہ دوبارہ اسی صورتِ حال سے نہ گزرنا پڑے۔

؎ اگلی محبتوں نے وہ نامرادیاں دیں تازہ رفاقتوں سے دل ہے ڈرا ڈرا سا (احمد فراز)

عبارت کے آخر میں وہ ایک شعر کے ذریعے اپنی کیفیت کو بیان کرتے ہیں۔ یہ شعر ان کی زندگی کے اس تضاد کو ظاہر کرتا ہے جہاں ایک طرف تو وہ اپنی اس ''سادہ لوحی'' یا کافی کے ساتھ ہوئے تجربے پر پشیمان ہیں تو دوسری طرف وہ ان لوگوں پر طنز کر رہے ہیں جو چائے کے دیوانے ہیں اور اس کے حصول کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ یہاں یوسفی صاحب کا مقصد لوگوں کے ذوق اور ترجیحات کا موازنہ کرنا ہے۔ کافی نوشی کے تلخ تجربے کے بعد وہ خود کو ایک ایسے مقام پر پاتے ہیں جہاں انھیں اپنی ہی حالت پر افسوس ہوتا ہے، لیکن ساتھ ہی وہ ان لوگوں کی زندگیوں کو دیکھتے ہیں جو چائے کی طلب میں ہر وقت تڑپتے رہتے ہیں۔ یہ موازنہ محض ایک تفریحی بات نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے یوسفی صاحب کی انسانی نفسیات پر گہری نظر ہے۔ وہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان اپنی عادات کا غلام ہے اور جب وہ کسی چیز کا عادی ہو جاتا ہے تو وہ اس کی نیکی اور بدی یا اس کے نقصانات کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ مصنف کا طنز یہاں بہت لطیف ہے، وہ خود کو ایک سمجھ دار اور محتاط انسان کے طور پر پیش کرتے ہیں جو کسی بھی چیز کو اندھا دھند اپنانے سے قاصر ہے جب کہ دوسری طرف وہ دنیا کو ایک ایسی جگہ سمجھتے ہیں جہاں ہر کوئی اپنی اپنی پسند کے حصار میں قید ہے۔

؎ یہ کیا عذاب ہے سب اپنے آپ میں گم ہیں زباں ملی ہے مگر ہم زباں نہیں ملتا (ندا فاضلی)

ہر انسان کی پسند، مزاج اور ذوق مختلف ہوتا ہے۔ فارسی مقولہ ہے:

ہر گلے بوئے دگر دارد

ترجمہ: ''ہر پھول کی خوش بو الگ ہوتی ہے۔''

مختصراً یوسفی صاحب نے اس عبارت میں اپنی ذات کو ہدفِ تنقید بنا کر مزاح پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی بے زاری کو ایک فلسفیانہ رنگ دیتے ہیں تاکہ بات محض کافی اور چائے تک محدود نہ رہے، بلکہ انسان کی عادتوں، اس کے تجربات اور ان تجربات سے پیدا ہونے والے خوف کی عکاسی کرے۔ یہ عبارت پڑھتے ہوئے قاری کو جہاں ایک طرف مسکراہٹ نصیب ہوتی ہے، وہیں دوسری طرف انسان کی ان چھوٹی چھوٹی کمزوریوں اور پسند و ناپسند کا احساس بھی ہوتا ہے جو ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں۔

یوسفی صاحب کا فن ہے کہ وہ عام سی بات کو اتنے منفرد انداز میں بیان کرتے ہیں کہ وہ یادگار بن جاتی ہے۔ اس عبارت میں بھی انھوں نے ثابت کیا ہے کہ وہ اردو مزاح کے افق پر ایک ایسا ستارہ ہیں جو اپنی تحریر کے ذریعے قاری کو سوچنے اور ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بقول احمد فراز:

؎ اس نے نظر نظر میں ہی ایسے بھلے سخن کہے　　میں نے تو اس کے پاؤں میں سارا کلام رکھ دیا

مشقی سوالات

۱ مختصر جواب دیں۔

(الف) مصنف کافی کو کیوں ناپسند کرتے تھے؟

جواب: کافی کے ناپسند کرنے کی مصنف کے پاس بہت سی وجوہات ہیں۔ ان میں سب سے اہم وجہ اس کی بو اور کڑواہٹ ہے۔ مصنف کو اس کی کڑواہٹ سے سخت چڑ ہے۔

(ب) کافی پینے والے انٹلیکچوئل کی کافی کے متعلق کیا رائے ہے؟

جواب: انٹلیکچوئل نے کافی کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ ''کافی پینے سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔'' ان کے مطابق کافی مفرح ہے اور دماغ کو روشن کرتی ہے۔

(ج) کافی ہاؤس میں لوگوں کے بیٹھنے اور ان کے رویّوں کے متعلق مصنف کا کیا نقطۂ نظر ہے؟ واضح کریں۔

جواب: کافی ہاؤس اہلِ ذوق کے لیے بہترین جگہ ہوتی ہے۔ وہاں سب دوست ملتے اور اپنے فکر و فن پر بات کرتے ہیں۔ کافی ہاؤس کی شام ایک دلکش ادبی اور پُرسکون سماں پیش کرتی ہے، جہاں گرما گرم کافی کی خوشبو اور دھیمی موسیقی کے ساتھ گپ شپ اور کتابوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

(د) کافی کے بارے میں استصوابِ رائے کا کیا نتیجہ نکلا؟

جواب: کافی کے بارے میں استصوابِ رائے کا انجام بہت بُرا نکلا۔ شائقین سے جب سوال کیا جاتا ہے تو جواب دینے کی بجائے وہ استفسار کرنے لگتے ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی مرد سے اس کی آمدن یا عورت سے اس کی عمر پوچھ لی جائے۔

(ہ) مصنف نے جوشاندہ گوارا ہونے کے کیا اسباب بتائے؟

جواب: مصنف کے مطابق جوشاندہ اس لیے گوارا ہے کہ اس سے ایک ملکی صنعت کو فروغ ملتا ہے اور ساتھ ہی نفسِ امارہ کو مارنے میں مدد بھی ملتی ہے۔

(و) عمدہ کافی بنانے کو کیمیا گری کیوں کہا گیا ہے؟

جواب: عمدہ کافی بنانے کو کیمیا گری سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح کیمیا گر کبھی خالص سونا نہیں بنا پاتا اور ہر بار کہتا ہے کہ بس ذرا سی کمی رہ گئی ایسے ہی کافی بھی اچھی نہیں بن پاتی تو بہانہ کیا جاتا ہے۔

۲ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

(الف) مصنف کو کافی میں بو آتی ہے:

(i) نسوار کی　　(ii) چائے کی　　(iii) سگریٹ کی　　(iv) سگار کی

(ب) معتبر بزرگوں سے سنا ہے کہ حقہ پینے سے پاس نہیں پھٹکتے:

(i) آلام (ii) تخیلات (iii) تفکرات (iv) غم

(ج) شلغم میں ہوتا ہے:

(i) وٹامن (ii) سوڈیم کلورائیڈ (iii) کیلشیم (iv) آئرن

(د) کافی قومی مشروب ہے:

(i) آسٹریلیا کا (ii) امریکا کا (iii) کینیا کا (iv) برطانیہ کا

(ہ) کافی کا جلا چائے بھی پیتا ہے:

(i) ٹھنڈی کر کے (ii) سونگھ سونگھ کر (iii) پھونک پھونک کر (iv) انتہائی گرم

جوابات

الف	سگارکی	ب	تفکرات	ج	وٹامن	د	امریکا کا	ہ	پھونک پھونک کر

۳ سبق ''کافی'' کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

(الف) گرم ممالک میں بحث کا آغاز صحیح معنوں میں قائل ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

جواب: اس جملے میں مصنف نے ہمارے رویوں پر گہرا طنز کیا ہے۔ ہمارے ہاں کسی بات پر بحث ہو جائے تو فوراً لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ لوگ بحث کے بعد قائل ہونے کے بجائے قائل ہونے کے بعد بحث کرتے ہیں۔ یعنی تسلیم کرنے کے بجائے ہٹ دھرمی کرتے ہیں۔

(ب) صاحب! میں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا۔

جواب: جب مصنف نے کافی پر تنقید کی تو اس کے دوست نے یہ جملہ کہا۔ وہ کھانے پینے کی چیزوں پر عقلی دلائل سننے کے قائل نہیں تھے۔

(ج) کافی پی پی کر سماج کو کوسنے والے ایک انٹلیکچوئل نے مجھے بتایا کہ کافی سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔

جواب: اس جملے میں خود ساختہ دانش ور پر طنز کیا گیا ہے۔ وہ سارا دن کافی پی کر معاشرے کے خلاف بولتے رہتے ہیں۔ ان کا کافی کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ اس کے پینے سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔

(د) امریکی کلچر کافی کے زور سے پھیلا یا کافی کلچر کے زور سے رائج ہوئی۔

جواب: امریکی کلچر میں کافی کا بہت زیادہ رواج ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ امریکہ میں کافی، کلچر کی وجہ سے پھیلی ہے یا پھر ان کا کلچر کافی سے پھیلا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم لگتے ہیں۔

(ہ) میں کافی سے اس لیے بیزار نہیں ہوں کہ مجھے چائے عزیز ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافی کا جلا چائے بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔

جواب: اس جملے میں مصنف نے کافی اور چائے کا تقابل کیا ہے۔ وہ کافی پر طنز چائے کی وجہ سے نہیں کر رہے بلکہ وہ تو چائے سے بھی کوئی خاص دل چسپی نہیں رکھتے۔

۴ سبق کافی کے متن سے کسی ایک پیراگراف کی تلخیص کریں اور عنوان بھی تجویز کریں۔

جواب: معلوم نہیں کافی کیوں، کب اور کس مردم آزار نے دریافت کی لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یونانیوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ اگر انھیں ذرا بھی علم ہوتا تو چرائتہ کی طرح یہ بھی یونانی طب کی جزو اعظم ہوتی۔ اس قیاس کو اس امر سے مزید تقویت ہوتی ہے کہ قصبوں میں کافی کی بڑھتی ہوئی کھپت کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عطائیوں نے ''اللہ شافی، اللہ

کافی'' کہ کر موخرالذکر کا سفوف اپنے نسخوں میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس قسم کی جڑی بوٹیوں کا استعمال عداوت اور عقدِ ثانی کے لیے مخصوص تھا۔ چوں کہ آج کل ان دونوں باتوں کو معیوب خیال کیا جاتا ہے، اس لیے صرف اظہارِ خلوصِ باہمی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

تلخیص: کافی یونانیوں کی دریافت نہیں ورنہ ان کی طب میں اس کا ذکر ہوتا۔ قصبوں میں کافی کے زیادہ استعمال کی وجہ عطائی ہیں جو نسخوں میں اس کا سفوف لکھ دیتے ہیں۔ پہلے ایسی چیزیں عداوت اور عقدِ ثانی کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ اب انھیں اظہارِ خلوصِ باہمی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

عنوان: کافی کی دریافت اور پھیلاؤ

۵ سبق ''کافی'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

جواب: دیکھیے سبق کا خلاصہ

۶ سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباسات کی تشریح کریں۔

(الف) ''آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مگر۔۔۔۔۔۔۔۔ مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔''

(ب) ''سنا ہے کہ چائے کے بڑے خوب صورت۔۔۔۔۔۔۔۔ کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔''

جواب: دیکھیے حصہ تشریحات

علاماتِ اوقاف

اوقاف، وقف کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ''رکنا''۔ اس طرح علاماتِ اوقاف کے لفظی معنی ہیں ''رکنے کی علامتیں''، یعنی ایسی علامتیں جو تحریر میں ایک جملے کو دوسرے جملے یا کسی لفظ یا حرف کو کسی دوسرے لفظ یا حرف سے الگ کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ انگریزی میں ان علاماتِ اوقاف کو Punctuation کہتے ہیں۔ اگر یہ علامتیں نہ ہوں تو عبارت کا مفہوم سمجھنے میں بہت دشواری پیش آئے۔

علاماتِ اوقاف کی تفصیل درج ذیل ہے:-

ختمہ (وقفِ مطلق) ۔ یہ چھوٹا سا خط جملے کے اختتام پر لگایا جاتا ہے۔ مخففات کے بعد بھی یہ علامت لگائی جاتی ہے۔ مثلاً انھوں نے ظہر کی نماز پڑھی۔، ن۔م۔ راشد وغیرہ۔

سکتہ (وقفِ خفیف)، یہ علامت سب سے چھوٹے / کم وقفے کو ظاہر کرتی ہے جو عبارت میں مختصر ٹھہراؤ کے لیے لگائی جاتی ہے۔ مثلاً: آم، خوبانی، انار اور سیب ذائقہ دار پھل ہیں۔

وقفہ (نصف وقف) ؛ یہ علامت جملے میں سکتہ سے زیادہ ٹھہراؤ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ایک جملے کے مختلف ذیلی حصوں کو جوڑنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ نیز کسی جملے میں مختلف الفاظ کی دو یا دو سے زائد تراکیب کے درمیان وقفہ کی علامت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ عالیہ اور عظمیٰ؛ طاہرہ اور زاہدہ؛ تسنیم اور ناز الگ الگ ٹولیوں میں بیٹھی ہیں۔

۲۔ لاہور پنجاب کا؛ کراچی سندھ کا؛ پشاور خیبر پختونخوا کا اور کوئٹہ بلوچستان کا دارالحکومت ہے۔

رابطہ (وقفِ لازم) : یہ علامت جملے میں وقفہ سے زیادہ ٹھہراؤ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ کسی کا قول، فرمان، مکالمہ، حوالہ، کہاوت یا ضرب المثل نقل کرنے سے پہلے اور جملے کے الگ حصوں میں ربط پیدا کرنے کے لیے بنیادی جملے کے بعد اس کے ذیلی حصوں سے پہلے رابطہ کی علامت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً: قائداعظمؒ نے فرمایا: ''کام، کام اور بس کام۔''

کسی نے سچ کہا ہے: ''گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔''

تفصیلیہ :- یہ علامت کسی بات کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے لگائی جاتی ہے۔ مثلاً: علم کے درج ذیل فائدے ہیں:-

استفہامیہ (سوالیہ) ؟ یہ علامت ہر طرح کے سوال کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔ مثلاً: تم کیا کر رہے ہو؟

واوین " " یہ علامت کسی قول یا اقتباس کے شروع اور آخر میں لگاتے ہیں۔ مثلاً: قائدِ اعظمؒ کا قول ہے: "ایمان، اتحاد، تنظیم"

قوسین () ۔ یہ علامت عبارت میں کسی بات کو دوسرے جملوں سے الگ کرنے کے لیے لگاتے ہیں۔ مثلاً: ڈاکٹر عبدالقدیر خاں (اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے) عظیم سائنس دان تھے۔ جملۂ معترضہ کو قوسین میں لکھتے ہیں۔

ندائیہ/ فجائیہ/استعجابیہ ! ۔ فجائیہ کی علامت خوف، محبت، حیرت، نفرت، خوشی، غم وغیرہ جیسے جذبات کے بے ساختہ اظہار کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً: واہ! کتنا حسین منظر ہے۔ حروف تخاطب کے بعد یہ علامت استعمال ہو تو ندائیہ کہلاتی ہے۔ مثلاً: جنابِ عالی!، السلام علیکم!، احمد! میری بات سنو۔

خطِ فاصل (ترچھا خط) / ۔ تحریر میں متبادل اسما، افعال اور بیانات کے درمیان خطِ فاصل کا استعمال کیا جاتا ہے اور عدالتی مراسلہ جات میں مختلف سیریل نمبروں کے درمیان اس علامت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً: (الف) میں/ہم اقرار کرتا/کرتے ہیں۔ (ب) بن/بنت وغیرہ

۷ ہر علامتِ وقف کو استعمال کرتے ہوئے ایک ایک جملہ تحریر کریں۔

جواب:

علامت	جملہ
ختمہ	مجھے کافی بہت پسند ہے۔
سکتہ	اقبال، عامر، اظہر اور بلال لاہور گئے۔
وقفہ	کراچی کی بریانی؛ لاہوری نان اور پشاور کے چپلی کباب بہت مشہور ہیں۔
رابطہ	قائداعظمؒ نے فرمایا: "کام، کام اور کام"
تفصیلیہ	پاکستان کے صوبے درج ذیل ہیں:۔
استفہامیہ	تمھارے امتحانات کب ہوں گے؟
واوین	بزرگ نے فرمایا: "اتفاق میں برکت ہے۔"
قوسین	احمد کا بھائی (اسلم) بہت اچھا کھلاڑی ہے۔
فجائیہ/ندائیہ	(فجائیہ) اُف! کتنی گرمی ہے۔ / (ندائیہ) عامر! میری بات سنو۔
خطِ فاصل	کوئی بھی لڑکا/لڑکی یہاں بیٹھ سکتا/سکتی ہے۔

۸ اپنی پسند کے مطابق چائے/کافی میں سے کسی ایک مشروب کی آپ بیتی تحریر کریں۔

جواب:

چائے

آج میں پسی ہوئی حالت میں ہوں۔ میں چائے ہوں۔ میرا سفر صدیوں پر محیط ہے، جو چین کے جنگلات سے شروع ہو کر دنیا بھر کے ڈرائنگ رومز، ہوٹلوں اور ہر خاص و عام کی میز تک پہنچا ہے۔

میری کہانی، میری زبانی سنیں۔ میری پیدائش چین کے سرسبز پہاڑوں میں ایک پودے کی صورت میں ہوئی۔ ایک قدیم چینی داستان کے مطابق قبلِ مسیح میں چین کے بادشاہ "شین نونگ" (Shennong) گرم پانی پی رہے تھے کہ اچانک میرے پودے سے کچھ پتے اڑ کر ان کے پانی میں جا گرے۔ اس سے پانی کا رنگ بدل گیا اور ایک خوشبودار مشروب بن گیا، یوں میری دریافت ہوئی۔

ابتدا میں مجھے چین میں ایک شاہی اور طبی جڑی بوٹی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ پھر وقت بدلا اور بدھ مت کے راہبوں نے مجھے اپنی عبادت میں بیداری اور توجہ برقرار رکھنے کا ذریعہ بنایا۔ مشرق سے مغرب کا سفر تجارتی قافلوں اور مسافروں کے ذریعے ہوا اور میں ایشیا کے دیگر ممالک تک پھیل گئی۔ 17 ویں صدی میں، انگریز تاجر مجھے یورپ لے

گئے جہاں میں نے شاہی محلوں میں دھوم مچادی۔ ہندوستان اور پاکستان کے خطے میں برطانوی دورِ حکومت میں، مجھے باقاعدہ طور پر ایک فصل کے طور پر اگایا گیا اور تب سے میں یہاں کے ثقافتی اور معاشرتی تانے بانے کا لازمی حصہ بن گئی۔

آج میں دنیا بھر میں پانی کے بعد سب سے زیادہ پیا جانے والا مشروب ہوں۔ لوگ مجھے مختلف طریقوں سے پیتے ہیں۔

سبز چائے: میں چین، جاپان اور صحت کے حوالے سے شعور رکھنے والوں کی پہلی پسند ہوں۔

دودھ پتی: میں پاکستان اور بھارت کی گلیوں اور چائے خانوں کی جان ہوں۔ لوگ مجھے بہت شوق سے پیتے ہیں۔

کالی چائے: میں لیموں اور چینی کے ساتھ دنیا بھر میں پسند کی جاتی ہوں۔ ایک پودے کے پتے سے لے کر آپ کے کپ تک کا میرا سفر گرم جوشی، محبت، دوستی اور تھکن مٹانے کا سفر ہے۔ صبح کی پہلی کرن ہو یا شام کی ٹھنڈی ہوا، دوستوں کی محفل ہو یا تنہائی کا ساتھ، میں ہر جگہ موجود ہوں۔

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ سبق "کافی" کے مصنف ہیں:
(الف) رشید احمد صدیقی (ب) پطرس بخاری (ج) مشتاق احمد یوسفی (د) مرزا فرحت اللہ بیگ (ج)

2۔ مشتاق احمد یوسفی کے مضمون "کافی" کا اصل ماخذ ہے:
(الف) چراغ تلے (ب) زرگزشت (ج) آبِ گم (د) خاکم بدہن (الف)

3۔ مصنف کے نزدیک کافی سے بو آتی ہے:
(الف) پھولوں کی (ب) عطر کی (ج) سگار کی (د) خشک میوے کی (ج)

4۔ کافی کی مہک کو سوندھی خوش بو قرار دینے والوں کے نزدیک یہ ہے:
(الف) قوتِ شامہ کی کوتاہی (ب) قوتِ شامہ کی خوبی (ج) لاعلمی (د) عقل مندی (الف)

5۔ کافی کا عطر ادبی محفلوں میں استعمال کرنے کا مشورہ مصنف نے دیا تھا:
(الف) سنجیدگی سے (ب) مذاق میں (ج) غصے میں (د) عادت کے طور پر (ب)

6۔ مصنف ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتے تاوقتیکہ وجہ ہو:
(الف) شوق (ب) عادت (ج) تلفظ کی مجبوری (د) پسند (ج)

7۔ کافی کے سوندھے پن کی مثال دی گئی ہے:
(الف) کھیر اور دھنگارے رائتے سے (ب) پلاؤ اور قورمے سے
(ج) بریانی اور کباب سے (د) حلوے اور پوری سے (الف)

8۔ مصنف کو دھنگارا اور کھرچن سے ہوتی ہے:
(الف) خوشی (ب) متلی (ج) بیزاری (د) دل چسپی (ب)

9۔ یو۔پی کے شرفا رغبت سے کھاتے ہیں:
(الف) کافی (ب) چائے (ج) کھرچن اور دھنگار (د) میوے (ج)

10۔ مصنف نے ہندوستان چھوڑنے کی وجہ بتائی:
(الف) ملازمت (ب) کھرچن اور دھنگار کا رواج (ج) غربت (د) موسم (ب)

11۔ کافی کے بارے میں استصواب رائے عامہ کا حشر ہوتا ہے:
(الف) بحث (ب) اتفاق (ج) خاموشی (د) تعریف (الف)

12۔ کافی کے بارے میں استفسار رائے عامہ کرتا ہے:
(الف) دانش مندی (ب) عاقبت نااندیشی (ج) فضول کام (د) نیک کام (ب)

13۔ کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا ہے:
(الف) ضرورت (ب) عادت (ج) بدمذاقی (د) دل چسپی (ج)

14۔ کافی سے بے زار شخص جو ملا، وہ تھا:
(الف) کافی ہاؤس کا مالک (ب) ڈاکٹر (ج) ادیب (د) استاد (الف)

15۔ کافی کے بارے میں ایک صاحب نے شعر پڑھا:
(الف) میر کا (ب) ذوق کا (ج) اقبال کا (د) سودا کا (ب)

16۔ کافی سے چڑ کی اصل وجہ معدے کے داغ بتانے والے صاحب کی نظریں تھیں:
(الف) تشخیص ناک (ب) پیار بھری (ج) غصے والی (د) حیرت ناک (الف)

17۔ مصنف کے ایمان کے مطابق قدرت کے کارخانے میں کوئی شے نہیں ہے:
(الف) بری (ب) اچھی (ج) بے کار (د) فضول (ج)

18۔ حقہ پینے سے تفکرات پاس نہیں پھٹکتے:
(الف) سچ (ب) غلط (ج) مبالغہ (د) شک (الف)

19۔ مرچیں کھانے کا فائدہ ہے کہ دب جاتا ہے:
(الف) بھوک (ب) کھانوں کا اصل رنگ اور مزہ (ج) پیاس (د) ذائقہ (ب)

20۔ خمیرۂ گاؤزبان کھانے کا ایک جائز طریقہ ہے:
(الف) بغیر راشن کارڈ کے شکر حاصل کرنا (ب) صحت (ج) ذوق (د) دکھاوا (الف)

21۔ جو شاندہ نفسِ امارہ کو مارنے کے ساتھ فروغ دیتا ہے:
(الف) صحت کو (ب) غیر ملکی صنعت کو (ج) ملکی صنعت کو (د) ذائقے کو (ج)

22۔ جدید طبی ریسرچ نے کافی کے بارے میں ثابت کیا ہے کہ اس میں سوائے کافی کے کچھ نہیں ہوتا:
(الف) شک (ب) غلط (ج) مبالغہ (د) سچ (د)

23۔ مصنف کے نزدیک کافی کی خوبی ہے کہ اس میں سوائے کافی کے:
(الف) ذائقہ ہوتا ہے (ب) کچھ نہیں ہوتا (ج) فائدہ ہوتا ہے (د) خوشبو ہوتی ہے (ب)

24۔ یونانیوں کو کافی کا علم ہوتا تو یہ طب میں جزوِ اعظم ہوتی:
(الف) چرائتہ کی طرح (ب) کسی دوا کی طرح (ج) عام جڑی بوٹی کی طرح (د) کسی غذا کی طرح (الف)

25۔ عطائیوں نے اپنے نسخوں میں کافی کا سفوف لکھا:
(الف) پیسے کمانے کے لیے (ب) بغیر کسی وجہ کے (ج) اللہ شافی، اللہ کافی کہہ کر (د) شوق میں (ج)

26۔ زمانۂ قدیم میں جڑی بوٹیوں کا استعمال مخصوص تھا:
(الف) عداوت اور عقدِ ثانی کے لیے (ب) صحت کے لیے (ج) ذوق کے لیے (د) تفریح کے لیے (الف)

27۔ چائے کے بارے میں سنا ہے کہ اس کے ہوتے ہیں:
(الف) وسیع کھیت (ب) خوب صورت باغ (ج) گھر (د) کارخانے (ب)

28۔ کافی کے اگنے کا مقام مصنف کے نزدیک ہے:
(الف) خود بخود (ب) آسمان (ج) زمین (د) باغ (ج)

29۔ کافی کا شمار ان نعمتوں میں نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ نازل کرتا ہے:
(الف) کھیتوں سے (ب) زمین سے (ج) باغوں سے (د) آسمان سے (د)

30۔ مصنف کو اپنا ملک عزیز ہے کیوں کہ یہاں:
(الف) کافی عام ہے (ب) کافی پیدا نہیں ہوتی (ج) چائے عام ہے (د) لوگ اچھے ہیں (ب)

31۔ ایک انگلیکچوئل کے مطابق کافی پینے سے کھل جاتا ہے:
(الف) دل کا کنول (ب) دماغ (ج) شوق (د) راستہ (الف)

32۔ کافی پینے سے بدن میں آتی ہے:
(الف) طاقت (ب) تیزی (ج) چُستی (د) سکون (ج)

33۔ کافی ہاؤس میں لوگ گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں کیوں کہ:
(الف) ماحول اچھا ہوتا ہے (ب) کافی پینے سے بدن میں چُستی آتی ہے
(ج) لوگ ملتے ہیں (د) وقت گزرتا ہے (ب)

34۔ کافی کا برتن لانے والی تھیں:
(الف) دوست (ب) خادمہ (ج) ملازمہ (د) بیگم (د)

35۔ مصنف کے نزدیک کافی بنانا ہے:
(الف) کیمیا گری (ب) فن (ج) مہارت (د) کام (الف)

36۔ کافی کا مخصوص نسخہ منتقل ہوتا رہتا ہے:
(الف) باپ سے بیٹے تک (ب) کتاب در کتاب (ج) سینہ بہ سینہ (د) کوئی نہیں (ج)

37۔ مشرقی افریقہ کے حبشی خانساماں نے کافی چھانی تھی:
(الف) چھلنی میں (ب) موزے میں (ج) کپڑے میں (د) کاغذ میں (ب)

38۔ آقا نے غضب ناک ہو کر پوچھا:
(الف) میرے قیمتی موزے (ب) کافی (ج) دودھ (د) پانی (الف)

39۔ مصنف کافی کی تندی اور تلخی سے گھبراتے ہیں:
(الف) کبھی کبھی (ب) تھوڑا (ج) بہت (د) بالکل نہیں (د)

40۔ مصنف عادی رہے ہیں:
(الف) چائے کے (ب) کافی کے (ج) یونانی دواؤں کے (د) کسی کے نہیں (ج)

41۔ مصنف کی قوت برداشت ہے:
(الف) بہت زیادہ (ب) بہت کم (ج) عام (د) کچھ نہیں (الف)

42۔ کڑواہٹ اور مٹھاس کی آمیزش سے جو قوام بنتا ہے، وہ ہے:
(الف) پسندیدہ (ب) برداشت سے باہر (ج) اچھا (د) برا (ب)

43۔ میزبان کے اصرار پر مصنف شکردان میں کافی کے چمچے ڈالنے کا کہتے ہیں:
(الف) تین (ب) ایک (ج) دو (د) چار (ج)

44۔ اشیائے خورد و نوش میں مصنف قائل نہیں:
(الف) مزے کا (ب) ذوق کا (ج) شوق کا (د) تہذیب حواس کا (د)

45۔ کھانے پینے کے معاملے میں مصنف کے نزدیک فیصلہ کن ہوتا ہے:
(الف) پہلا گھونٹ (ب) دوسرا گھونٹ (ج) پورا کھانا (د) خوش بو (الف)

46۔ مصنف ہر کافی پینے والے کو سمجھتے ہیں:
(الف) دوزخی (ب) جنتی (ج) عام انسان (د) نیک (ب)

47۔ کافی ہے:
(الف) یورپ کا مشروب (ب) امریکا کا قومی مشروب (ج) ایشیا کا مشروب (د) افریقہ کا مشروب (ب)

48۔ کافی کے زور سے پھیلا:
(الف) یورپی کلچر (ب) ایشیائی کلچر (ج) امریکی کلچر (د) کوئی نہیں (ج)

49۔ امریکی جیلوں میں قیدیوں کو پلائی جاتی ہے:
(الف) شربت (ب) چائے (ج) دودھ (د) کافی (د)

50۔ نزع کے وقت کافی کے قطرے ٹپکانے سے مریض کا دم:
(الف) آسانی سے نکل جائے (ب) رک جائے (ج) بہتر ہو جائے (د) کچھ نہ ہو (الف)

51۔ مصنف کافی سے اس لیے بے زار نہیں کہ انھیں چائے عزیز ہے، بلکہ کافی کا جلا:
(الف) چائے پھونک پھونک کر پیتا ہے (ب) کافی سے ڈرتا ہے (ج) چائے نہیں پیتا (د) کچھ نہیں (الف)

52۔ کافی کو مصنف قرار دیتے ہیں:
(الف) نعمت (ب) عذاب (ج) دوا (د) غذا (ب)

53۔ کافی میں سے سگار کی سی بو آنے والی بات کی ہے:
(الف) مصنف نے (ب) میزبان نے (ج) دوست نے (د) ڈاکٹر نے (الف)

54۔ کافی کی مہک کو سوندھی خوش بو کہنے والے کی ہے:
(الف) بدذوقی (ب) لاعلمی (ج) قوتِ شامہ کی کوتاہی (د) بے خبری (ج)

55۔ کافی کا عطر ادبی محفلوں میں استعمال کرنے کا مشورہ مصنف نے دیا:
(الف) سنجیدگی سے (ب) طنزیہ طور پر (ج) خوش ہو کر (د) تجربے کے لیے (ب)

56۔ ماکولات میں معقولات کا دخل نہ دینے والے صاحب کا تعلق تھا:
(الف) کافی پینے والوں سے (ب) چائے پینے والوں سے (ج) کافی ہاؤس سے (د) کسی سے نہیں (الف)

57۔ کافی کی مہک کی تعریف کرنے والے کے نزدیک ضرورت ہے:
(الف) علم کی (ب) عادت کی (ج) دولت کی (د) تربیت یافتہ ذوق کی (د)

58۔ مصنف کے نزدیک کافی کی مہک سے متلی ہوتی ہے:
(الف) غلط (ب) سچ (ج) مبالغہ (د) مذاق (ب)

59۔ کافی پینے والے کافی کو قرار دیتے ہیں:
(الف) خوش ذائقہ (ب) بدذائقہ (ج) کڑوی (د) معمولی (الف)

60۔ کافی کی تعریف سن کر مصنف کہتے ہیں:
(الف) یہ غلط ہے (ب) میں نہیں مانتا (ج) کسی بچے کو پلا کر صورت دیکھ لیجیے (د) مجھے کیا (ج)

61۔ بچوں کو بحث میں گھسیٹنے پر مصنف کو ٹوکا گیا:
(الف) بیگم کی طرف سے (ب) کافی پینے والے کی طرف سے
(ج) دوست کی طرف سے (د) کسی کی طرف سے نہیں (ب)

62۔ بچے اور بلیاں پینے کی چیزوں میں تمیز رکھتے ہیں:
(الف) برے بھلے کی (ب) اچھی بری کی (ج) کڑوی میٹھی کی (د) کسی چیز کی نہیں (الف)

63۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ پکے راگ ایجاد ہیں:
(الف) فنکاروں کی (ب) انسانوں کی (ج) بچوں اور بلیوں کی (د) کسی کی نہیں (ج)

64۔ ثقافتی مسائل کا فیصلہ نہیں چھوڑ سکتے:
(الف) ادیبوں پر (ب) بچوں اور بلیوں پر (ج) عوام پر (د) حکومت پر (ب)

65۔ مصنف کافی کے بارے میں استصواب رائے عامہ کرتے رہے:
(الف) اکثر (ب) کبھی کبھار (ج) کبھی نہیں (د) ایک بار (الف)

66۔ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسار ہے:
(الف) تفریح (ب) دانش مندی (ج) ضرورت (د) عاقبت نااندیشی (د)

67۔ سچے الزام سے تن بدن میں لگ جاتی ہے:
(الف) آگ (ب) خوشی (ج) سردی (د) تھکاوٹ (الف)

68۔ ایک کرم فرمانے کافی سے بے زاری کو محمول کیا:
(الف) لاعلمی پر (ب) غربت پر (ج) محرومی پر (د) بیماری پر (ج)

69۔ کافی کی تیزابیت سے جل اٹھتے ہیں:
(الف) معدے کے داغ (ب) دانت (ج) گلا (د) پیٹ (الف)

70۔ کافی کے بارے میں مصنف کا ایمان ہے:
(الف) یہ بری ہے (ب) قدرت کے کارخانے میں کوئی شے بے کار نہیں (ج) یہ اچھی ہے (د) یہ زہر ہے (ب)

71۔ تمبا کو خراب ہو تو پاس نہیں پھٹکتا:
(الف) کوئی بھی (ب) لوگ (ج) دوست (د) دشمن (الف)

72۔ کافی کی بڑھتی ہوئی کھپت کی ایک وجہ ہے:
(الف) صحت (ب) ذوق (ج) عطائیوں کے نسخے (د) ذائقہ (ج)

73۔ کافی کو پسند کرنے والوں سے مصنف پوچھتے ہیں:
(الف) کافی کیوں عزیز ہے (ب) کافی کیوں پیتے ہیں (ج) کافی کیسی ہے (د) کچھ نہیں (الف)

74۔ کافی پینے سے آدمی چہکنے لگتا ہے:
(الف) شک (ب) غلط (ج) مبالغہ (د) سچ (د)

75۔ کافی ہاؤس میں لوگ جاتے ہیں:
(الف) سکون سے (ب) دوڑ دوڑ کر (ج) کبھی کبھی (د) کبھی نہیں (ب)

76۔ حبشی خانساماں نے کافی چھانی تھی:
(الف) موزے میں (ب) چھلنی میں (ج) کپڑے میں (د) کاغذ میں (الف)

77۔ کافی کی تندی اور تلخی سے مصنف:
(الف) ڈرتے ہیں (ب) گھبراتے ہیں (ج) ذرا نہیں گھبراتے (د) کوئی نہیں (ج)

78۔ کافی پینے والے کے نزدیک انکار ہے:
(الف) سچ (ب) تکلف (ج) جھوٹ (د) مذاق (ب)

79۔ مصنف کے نزدیک پہلی محبت میں کارفرما ہوتا ہے:
(الف) خلوص (ب) سچائی (ج) نیت کا فتور (د) کچھ نہیں (ج)

80۔ کافی کے بارے میں مصنف بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ:
(الف) کافی اچھی ہے یا بری (ب) امریکی کلچر کافی کے زور سے پھیلا یا کافی کلچر کے زور سے
(ج) کافی کیسے بنتی ہے (د) کچھ نہیں (ب)

81۔ کافی کے سریع التاثیر ہونے میں:
(الف) کوئی کلام نہیں (ب) کلام ہے (ج) شک ہے (د) کچھ نہیں (الف)

82۔ کافی پر فاتحہ دلانے کی تجویز پر مصنف کو اعتراض ہے:
(الف) شاید (ب) ہے (ج) نہیں (د) کوئی نہیں (ج)

83۔ کافی سے متعلق خیالات کا اظہار کیا ہے:
(الف) پطرس بخاری نے (ب) مشتاق احمد یوسفی نے (ج) رشید احمد صدیقی نے (د) کسی نے نہیں (ب)

84۔ مضمون ''کافی'' کا تعلق صنف سے ہے:
(الف) سفرنامہ (ب) افسانہ (ج) ناول (د) مزاح (د)

85۔ مشتاق احمد یوسفی کو مزاح نگاری میں مقام حاصل ہے:
(الف) ممتاز (ب) عام (ج) معمولی (د) کوئی نہیں (الف)

86۔ کافی کے بارے میں مصنف کے تجربات ہیں:
(الف) عام (ب) خوش گوار (ج) تلخ (د) اچھے (ج)

87۔ کافی کی تندی اور تلخی کو مصنف برداشت کرتے رہے ہیں:
(الف) جوانی سے (ب) بچپن سے (ج) بڑھاپے سے (د) کبھی نہیں (ب)

88۔ کافی کی تعریف کرنے والے صاحب کو غصہ آتا ہے:
(الف) مصنف سے (ب) کافی سے (ج) معصوم بچوں پر بات کرنے سے (د) کسی سے نہیں (ج)

89۔ مصنف کافی کو قرار دیتے ہیں:
(الف) میٹھا زہر (ب) اچھی چیز (ج) عام چیز (د) مفید (الف)

90۔ کافی ہاؤس میں کافی کے بارے میں استفسار رائے عامہ کا حشر ہوا:
(الف) اچھا (ب) خوش گوار (ج) عام (د) تلخ (د)

91۔ مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں میں ہے:
(الف) طنز و مزاح (ب) سنجیدگی (ج) غمناکی (د) خوشی (الف)

92۔ کافی کا ذکر مشتاق احمد یوسفی کی کس کتاب میں ہے؟
(الف) زرگزشت (ب) چراغ تلے (ج) آب گم (د) خاکم بدہن (ب)

93۔ سبق ''کافی'' کی صنف ہے:
(الف) مزاحیہ مضمون (ب) ناول (ج) افسانہ (د) سفرنامہ (الف)

94۔ مصنف نے کافی پی تھی:
(الف) عادت کے طور پر (ب) شوق میں (ج) میزبان کے اصرار پر (د) صحت کے لیے (ج)

95۔ کافی پینے والے اسے قرار دیتے ہیں:
(الف) معمولی مشروب (ب) پرکیف مشروب (ج) کڑوا مشروب (د) اچھا مشروب (ب)

96۔ مصنف کو کافی سے آتی ہے:
(الف) سگار کی بو (ب) عطر کی خوش بو (ج) کافی کی مہک (د) کچھ نہیں (الف)

97۔ کافی پینے والوں کو کافی سے آتی ہے:
(الف) بدبو (ب) سوندھی خوش بو (ج) کڑواہٹ (د) کچھ نہیں (ب)

98۔ کافی کے بارے میں بحث کرنے والے صاحب کو غصہ آتا ہے:
(الف) مصنف کے مذاق سے (ب) کافی کی برائی سن کر (ج) پسند کے خلاف بات سن کر (د) کسی سے نہیں (ج)

99۔ ''کافی'' مضمون ہے:
(الف) ایک مشروب کے بارے میں (ب) ایک شخص کے بارے میں
(ج) ایک واقعہ کے بارے میں (د) ایک جگہ کے بارے میں (الف)

100۔ مشتاق احمد یوسفی کا مزاح ہے:
(الف) عام (ب) شائستہ اور گہرا (ج) معمولی (د) کوئی نہیں (ب)